اقبالؒ اور پیرویِ شبلیؒ

مُصنّفہ

ڈاکٹر سیّد افتخار حسین شاہ

ناشر

سید افتخار حسین شاہ

صدر شعبۂ اردو، ملتان یونیورسٹی

ناشر

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئیوالان نئی دہلی ۲

پہلی بار . . . . . فروری . . . ۱۹۷۸ء

باہتمام جناب ڈاکٹر سید خواجہ ناصر الدین صاحب دہلوی

Rs16/50
قیمت . . . . ساڑھے سولہ روپے

کتابت . . . . ضرار احمد خان

مطبوعہ . . . . . اردو لیتھو پرنٹنگ پریس دہلی

سول ایجنٹ

ادبی مرکز جامع مسجد گورکھپور
نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ

ناشر

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئیوالان نئی دہلی ۲

فہرست

انتساب

(۱) بسلسلہ اقبال شناسی اپنے پہلے راہنما والد صاحب قبلہ سید محمد صادق نعمتؔ مرحوم کے نام جن کے ارشاد گرامی کے مطابق میں نے بچپن میں اُردو کی جو پہلی نظم زبانی یاد کی وہ حکیم الامت کی مشہور نظم بعنوان "فرمانِ خدا" (فرشتوں سے) تھی۔

(۲) بسلسلہ اقبال شناسی اپنے دوسرے اور آخری راہنما استادِ گرامی قدر جناب سید عابد علی عابدؔ مرحوم کے نام جنھوں نے مطالعہ اقبال کی واضح، قطعی اور روشن راہیں دکھائیں اور اقبالیات کے متعلق اظہارِ خیال کے لیے قلم پکڑنے کا حوصلہ بخشا۔

پیش لفظ

علامہ اقبال کی زندگی اور ان کی سرگرمیوں کے مختلف پہلوؤں کے متعلق سید افتخار حسین شاہ نے گزشتہ بیس سالوں یا اس کے قریب کی مدت میں جو مضامین لکھے تھے۔ وہ اقبال اور پیرِ دی شبلی، کی صورت میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل چودہ مضامین جو مختلف مواقع پر معرضِ تحریر میں آئے۔ حیاتِ اقبال اور افکارِ اقبال کے سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ان میں تحقیق، تعلیم، کشمیر، فطرت اور خود احتسابی جیسے مختلف موضوعات پر اقبال کے حوالہ سے موثر صورت میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

ترجمانِ حقیقت کو کشمیر کے ہر پہلو سے جو عشق تھا۔ مصنف نے اسے بہت کامیابی سے نمایاں کیا ہے۔ محقق اور نقاد کی صورت میں بھی اقبال کے کارناموں کا بہت اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔ رسولِ کریمؐ اور قرآن حکیم سے حکیم الامت کو جو گہری عقیدت تھی۔ اس کی نشاندہی ان مضامین میں بااحسن طریق کی گئی ہے۔

اس تصنیف میں حیاتِ اقبال کے علاوہ حیاتِ شبلی کے بھی بعض گہرے اور مانوس نقوش ملتے ہیں۔ ماضی کے کارناموں کے متعلق تحقیقی کاوشوں کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کو بیدار کرنے اور اسے شاہراہ ترقی پر گامزن دیکھنے کی علامہ اقبال کو جو آرزو تھی، اس کا احساس اس مجموعے میں شامل ہر مضمون سے

ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کی دلچسپی صرف ان زبانوں کے ذخیرہ معلومات تک محدود نہ تھی، جو وہ جانتے تھے بلکہ ہر اس زبان تک تھی۔ جس میں ملت اسلامیہ کی عظمت کا کوئی بھی نشان ملتا تھا۔ کسی بھی مسلمان سائنسدان یا مورخ یا فن تعمیر کے ماہر کی کسی ایسی فنی مہارت کا ذکر کیا گیا تھا جو مسلمانوں کے سیاسی انحطاط یا زوال کی وجہ سے اب مسلمانوں کے علم میں نہیں تھی۔ اس سلسلہ میں وہ مالی دشواریوں کے باوجود اپنی جیب سے بھی اخراجات ادا کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

اقبالیات کے سلسلہ میں یہ تصنیف ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ مصنف اس پیش کش کے لئے مبارک باد کا مستحق ہے۔

۲۶ فروری ۱۹۷۷ء

(پروفیسر ڈاکٹر محمد الطاف علی قریشی)
وائس چانسلر، ملتان یونیورسٹی۔

احوالِ مُصنّف

یومِ ولادت ـــــــــــ ۱۸ نومبر ۱۹۳۱ء

تعلیم :-

بی۔ اے آنرز ۱۹۵۰ء

ایم۔ اے (اردو) ۱۹۵۲ء

ایم۔ اے (فارسی) ۱۹۵۳ء

ملازمت :-

ریسرچ سکالر پنجاب یونیورسٹی۔ اپریل تا نومبر ۱۹۵۳ء

لیکچرر زمیندار کالج، گجرات نومبر ۱۹۵۳ء تا ۸ جون ۱۹۵۶ء

لیکچرر گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ ۹ جون تا ۲۷ ستمبر ۱۹۵۸ء

لیکچرر گورنمنٹ (ایمرسن) کالج ملتان ۲۸ ستمبر ۱۹۵۸ء تا ۲۵ دسمبر ۱۹۷۰ء

اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج ملتان ۲۶ دسمبر ۱۹۷۰ء تا ۳۱ اگست ۱۹۷۵ء

اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبہ اردو ملتان یونیورسٹی یکم ستمبر ۱۹۷۵ء تا حال۔

زیرِ طبع تصانیف :-

۱۔ منشی سجاد حسین ایڈیٹر، اودھ پنچ، لکھنؤ۔

۲۔ اسالیبِ نثرِ اردو۔

۳۔ چند باتیں چند یادیں (مولانا غلام رسول مہر۔ مرزا ادیب۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ سید جابر علی جابر۔ عبدالعزیز خالد۔ آغا صادق۔ حافظ لدھیانوی پروفیسر مولوی محمد یعقوب۔ رفیق خاور جسکانی مرحوم اور اکبر لاہوری کے متعلق مضامین)

۴۔ تحسین و تنقیص (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

نکتۂ استحقاق

میں بظاہر اقبالیات کا معلم ہوں لیکن حقیقت میں متعلم ہوں۔ بہرصورت یہ دونوں حیثیتیں ایسی ہیں کہ جن سے مجھے اقبال اور ان کے افکار کے متعلق کچھ کہنے یا لکھنے کا حق پہنچتا ہے۔ حق ہی نہیں، بلکہ میں یہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہوں کہ اقبال شناسی کی راہ پر چلوں۔ ان کے استعاروں میں ان کے دل کا مطلب سمجھنے کی کوشش کروں۔ شریعت کو ذوق تکلم کی گریباں گیر ہونے سے روکنے والے کا مقلد بنوں۔ بزم جہاں کے دل کش ہنگامے ان کی نظر سے دیکھوں، ہندوستان کے ماہ سیماؤں کی اس بات کو ڈھونڈوں جسے اقبال یورپ میں عبث ڈھونڈتے رہے۔ اس اقبال سے آگاہ ہونے کے لئے کوشاں رہوں جو خود اقبال سے آگاہ نہ ہونے کا اعلان فرماتے رہے۔

ان احساسات نے گزشتہ چوبیس پچیس سالوں میں مختلف اوقات میں مجھ سے جو مضامین لکھوائے ان میں سے چودہ اس مجموعے میں شامل ہیں۔ چار مضامین پہلی بار طبع ہو رہے ہیں۔ دس مضامین مختلف اخبارات اور رسائل میں اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ میں ان اخبارات اور رسائل کا شکر گزار ہوں جن کے تعاون سے میری تحریریں مطبوعہ صورت میں محفوظ ہو گئیں۔ بالخصوص روزنامہ امروز، لاہور کا کہ جس نے بلا مطالبہ قلمکار کی مزدوری ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھا۔

میں اپنے مضامین کی اہمیت اور افادیت کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ میں نے اپنا حق کس طرح حاصل کیا ہے؟ میں نے اپنا فرض کس صورت میں ادا کیا ہے؟ یہ فیصلہ کرنا قارئین اقبال کا کام ہے ان کا حق ہے۔ یہ ان کا فرض ہے۔

آخری میں یہ اعتراف کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کو مجموعی کی صورت میں شائع کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ محترم مکرم جناب ڈاکٹر... معین الرحمٰن صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج، لائلپور اور جناب نیاز احمد مالک سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے ذاتی دلچسپی اور کوشش سے میری مشکل کو آسان بنایا۔ میں ان کا بھی احسان مند ہوں۔

افتخار حسین شاہ

اقبال اور پیروی شبلی

"مخزن" کے سابق مدیر شیخ عبدالقادر بانگِ درا کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:
"اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب
کو اُردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے ان کی روح کو
عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی
میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے
پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں، دوبارہ جنم لیا اور
محمد اقبال نام پایا۔"

شیخ عبدالقادر کی طرح سے سوچتے ہوئے میں یہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں
کہ اگر میں مسئلہ حلول کا قائل ہوتا تو یہ اعلان کرتا کہ شبلی کی روح کا جسدِ
اقبال میں حلول ہوا تھا یا یہ کہتا کہ اگر شبلی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے قریب قصبہ
بندول میں پیدا ہونے کی بجائے ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوتے تو
وہ اقبال ہوتے۔ میرے اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ میں شبلیات اور اقبالیات
کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اقبال اپنی زندگی اور نظریات
کے اعتبار سے مجموعی صورت میں اُردو اور فارسی کے اپنے پیشرو شاعروں
اور نثر نگاروں میں سے سب سے زیادہ جس کے قریب نظر آتے ہیں وہ مولانا

شبلی ہیں۔

گو اس میں شک نہیں کہ اقبال نے اپنی شاعری کے پہلے دور میں یعنی ۱۹۰۵ء تک سر سید غالب اور داغ کے متعلق نظمیں لکھ کر ان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے اور ان سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۰۵ء تک نہ تو ابھی شبلی کے علمی اور ادبی کمالات منظر عام پہ آئے تھے اور نہ اقبال با کمال نے تھے شبلی کی ایمان شناسی، قرآن دوستی اور عشق رسول کا دور صحیح معنوں میں اس کے بعد کا دور ہے اور ان تینوں پہلوؤں کی واضح قطعی اور روشن ترجمانی کا آغاز اقبال کے ہاں اسرار خودی کے سال تصنیف اور شبلی کے سال وفات ۱۹۱۴ء سے ہوتا ہے۔ یہ پہلو اقبال کی صرف شاعری کے نمایاں پہلو نہیں ہیں بلکہ ان کی جملہ علمی اور ادبی تخلیقات بلکہ مجوزہ تصانیف کے بنیادی عناصر ہیں۔ یہ عناصر جس طرح کلی اور یکساں صورت میں عمدگی کے ساتھ شبلی اور اقبال کی نظم و نثر میں ملتے ہیں، غالب، سر سید، اکبر الہ آبادی۔ داغ۔ آزاد اور حالی میں سے کسی کے ہاں نہیں ملتے۔ تخصیص اقبال میں سے، شعر اقبال، کے مصنف سید عابد علی عابد اقبال کو شبلی سے بہت متاثر، قرار دینے سے پہلے لکھتے ہیں:

"شبلی نعمانی سے اقبال کا متاثر ہونا بعید از قیاس نہیں کیونکہ وہ لاکھ سر سید کے مخالف ہو جائیں رہتے وہ سر سید کے دائرے ہی کے آدمی ہیں۔ اگر اکرام صاحب کے اس قول کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے کہ شبلی سر سید کی تحریک کے ردِ عمل کی پیداوار ہیں اور اقبال بھی اسی ردِ عمل کے علم برداروں سے متاثر ہے تو بھی معاملے کی صورت وہی رہتی ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ شبلی اور اقبال کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بہت سے پہلو ایک جیسے تھے۔ دونوں کے نظریات میں بہت ہم آہنگی اور یگانگت تھی۔ دونوں کا مقصد ایک تھا۔ دونوں کی منزل ایک تھی۔ دونوں ایک ہی زلفِ مجازی اور ایک ہی زلفِ حقیقی کے اسیر تھے۔ دونوں اسلام کی عظمتِ رفتہ کو واپس لانے کے لیے انفرادی اور اجتماعی صورت میں دل و جان سے کوشاں تھے۔ اس نقطۂ نظر سے میں نے جب شبلیات اور اقبالیات کا مطالعہ کیا تو مندرجہ ذیل پہلو خاص طور پر قابلِ توجہ دیئے:

الف۔ انفرادی زندگی:۔

۱۔ دونوں کے اجداد غیر مسلم تھے۔ شبلی راجپوت نسل سے تھے اور اقبال اصلاً کشمیری برہمن تھے۔ دونوں نسلیں حق بینی اور حق گوئی کے لئے مشہور رہیں۔

۲۔ دونوں بزرگ تصوّف میں دلچسپی رکھتے تھے۔

۳۔ دونوں نے ابتدائی تعلیم دینی مدارس میں حاصل کی۔ دونوں کو تحصیلِ علم کا اتنا شوق تھا کہ اپنے آبائی قصبوں اور مختلف سہولتوں کو چھوڑ کر دوسرے شہروں میں جاکر تعلیم حاصل کی۔

۴۔ دونوں نے اُردو عربی اور فارسی میں مہارت حاصل کرنے کے علاوہ مغربی زبانیں بھی سیکھیں۔

۵۔ دونوں کا شاعری کی طرف فطری میلان تھا اور دونوں بلند پایہ ادبی ذوق کے مالک تھے۔ دونوں اُردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ دونوں کے کلام پر شروع میں داغؔ کا اثر نظر آتا ہے۔ اور نظموں میں اکبری رنگ جھلکتا ہے۔ مغربی تہذیب پر طنز ملتی ہے۔

۶۔ دونوں کو خوبی قسمت سے ایسے اساتذہ کی صحبت میسر آئی تھی کہ جو اپنے اپنے میدان کے شاہسوار تھے اور جوہر قابل کو بہت نمایاں کرنے والے تھے۔

۷۔ دونوں کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں تھی۔ شبلی نے دو شادیاں کیں اور اقبال تین بار دولہا بنے تھے۔

۸۔ دونوں کے بڑے بیٹوں سے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی۔ شبلی کا بڑا بیٹا حامد ایک بار خود گھر سے ناخوشگوار ماحول سے تنگ آکر بھاگ نکلا اور جوگیانہ روپ میں ایک خانقاہ میں پناہ لی۔ چند ماہ کے بعد اپنے والد کے نہیں بلکہ مرشد کے اصرار پر گھر میں واپس آیا۔ اقبال نے اپنے بڑے بیٹے آفتاب کو عاق کر دیا۔ واپسی کی صورت ہی پیدا نہ ہو سکی۔ اولاد سے محبت ایک غیر معمولی جذبہ ہے۔ اس جذبے کو نظر انداز کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ترک تعلق کی وجوہات کچھ بھی ہوں۔ اس سے یہ پہلو ضرور سامنے آتا ہے کہ وہ اپنے ارادوں اور فیصلوں پر اولاد کی محبت کو بھی قربان کرنے والے تھے۔ وہ بے پناہ قوت ارادی کے مالک تھے۔

۹۔ دونوں کو یکے بعد دیگرے پروفیسر آرنلڈ کی قربت اور راہنمائی حاصل ہوئی، دونوں نے آرنلڈ کے متعلق شعر کہے۔

۱۰۔ دونوں کو عطیہ فیضی سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ دونوں کو کچھ عرصے کے لیے اُس کی قربت بھی حاصل ہوئی اور دونوں کی اس سے خط و کتابت بھی رہی۔ دونوں علمی مسائل اور گھریلو الجھنوں کے سلسلے میں اسے راز دان بناتے رہے اور اس کی ذہانت اور علم و فضل سے متاثر ہو کر اپنی علمی اور ادبی تخلیقات معرضِ وجود میں لاتے رہے۔ شبلی سے عطیہ فیضی کے خاندان سے تعلقات ۱۸۹۲ء سے تھے۔ جب وہ قسطنطنیہ میں عطیہ فیضی کے والد حسن

حبیب آفندی سے ملے تھے۔ اس ملاقات کا ذکر شبلی کے مکتوب بنام سرسید احمد خاں مورخہ ۱۵ / جون ۱۸۹۲ء میں بدیں الفاظ ملتا ہے:۔

"ہاں آج میں حسن حبیب آفندی سے جو بمبئی میں سفیر تھے اور اب یہاں پولیس جنرل ہیں، ملا، بے انتہا مہربانی کی۔ گھر کے تمام کمرے دکھائے، دعوت کی اور بہت مہربانیاں کیں، وہ اردو بخوبی بولتے ہیں۔"

"شبلی کی حیات معاشقہ" کے مصنف ڈاکٹر وحید قریشی کے بیان کے مطابق ۱۸۹۲ء میں عطیہ غالباً ایک آدھ برس کی بچی تھی۔ اس بچی سے اس کے اپنے بیان کے مطابق شبلی کی دوبارہ ملاقات لکھنؤ میں شیخ منیر حسین قدوائی کے دولت خانے پر ہوئی۔ اس کے بعد مولانا شبلی بمبئی گئے تو انہوں نے عزیزوں کی طرح ان کا استقبال کیا۔ چونکہ ۲۶ / ستمبر ۱۹۰۶ء کو بمبئی سے واپسی ہوئی اس لئے لکھنؤ میں پہلی ملاقات یقیناً ۲۶ / ستمبر سے پہلے ہوئی ہوگی۔ اپریل ۱۹۰۷ء میں عطیہ یورپ میں تھیں اور علامہ اقبال سے ان کا میل جول شروع ہو گیا تھا لیکن ابھی تخاطب

MYDEAR miss FYZEE

تک محدود تھا یورپ سے عطیہ ستمبر ۱۹۰۷ء میں لوٹیں اور دوسرا سفر یورپ اپریل ۱۹۰۸ء کے آخری دنوں میں کیا اور اسی سال اسے اپنی والدہ کی بیماری کے باعث لوٹنا پڑا۔"

عطیہ والے معاملے نے بہت جلد انتہائی شکل اختیار کر لی ۷ / جولائی ۱۹۱۱ء ... کو علامہ اقبال کے خطوں کے القاب کبھی مائی ڈیر عطیہ کی جگہ مائی ڈیر مس فیضی ہو گئے اور ایک منحوس صبح کو مولانا کو معلوم ہوا کہ عطیہ کسی اور کی ہو گئی ہے۔ اس نے ایک یہودی سے شادی کر لی۔ کون جانتا ہے، اس دہشت ناک تجربے ان پر کیا گزری ہوگی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد مہدی حسن کو لکھتے ہیں۔

"قرآن میں ہے کہ یہودی ذلیل و خوار بنا دیئے گئے لیکن کیا ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۲ء کے بعد بھی جس دن کہ ۔ ۔ ۔ ایک یہودی کے ہاتھ آئی مشہور کیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا۔ اس لئے تو نہیں ؎

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

خیر ؎ سحر راز نار کو دست و کند (۱۳ر دسمبر ۱۹۱۲ء) وہ خوش نصیب یہودی ایک مشہور آرٹسٹ رحیمن تھا۔ اس کے بعد مولانا فیضی خاندان سے ملتے رہے لیکن جذبات کا وہ طوفان جو چند سال قبل کی فارسی غزلیات میں موجزن تھا۔ اب تھم چکا تھا۔"

دسمبر ۱۹۱۲ء میں عطیہ کی شادی ہوئی۔ ۱۹۱۳ء میں اقبال نے یکے بعد دیگرے دو شادیاں کیں اور اس کے بعد بقول مولانا عبدالمجید سالک (مصنف ذکرِ اقبال) "اقبال کی زندگی کا اسلوب کاملاً بدل گیا۔" عطیہ سے شبلی اور اقبال کے تعلقات اگر عاشقانہ تسلیم کیا جائے تو پھر مشرق کی عشقیہ روایات کے مطابق دونوں میں رقابت کا امکان نظر آتا ہے۔ یہ تعلق ایسا تھا کہ دونوں میں اختلاف کا باعث بن سکتا تھا کیونکہ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۱ء تک کے دور میں دونوں کی طرف سے دلی جذبات کے ترجمان خطوط عطیہ کو لکھے گئے۔ ان خطوط میں رقابت کا پہلو ڈھونڈنے کے لئے جب میں نے ان کا مطالعہ کیا تو اقبال کے خطوط میں نہ تو کہیں شبلی کا نام ملا اور نہ ہی رقابت کی جھلک نظر آئی۔ شبلی نے عطیہ کو ۴ار اگست ۱۹۰۹ء کو جو خط لکھا تھا۔ اس میں البتہ اقبال کا ذکر اس طرح ملتا ہے۔

"تم نے میرے سوالوں کا جواب تو نہیں لکھا۔ میری اور مسٹر اقبال کی تعریف میں خط کو پورا کر دیا۔ میں نے پوچھا یہ تھا کہ جناب بیگم صاحب کے عطیہ کی رسید جو میں نے نظم میں لکھی ہے۔ کس کے نام بھیجوں۔"

اس سے پہلے ۱۲ر اکتوبر ۱۹۰۸ء کو البتہ یورپ کی شکایت ان الفاظ میں کرچکے ہیں
"یورپ نے آپ کو ہم لوگوں کی سطح سے بہت بالاتر کر دیا ہے۔ اس
لئے یہ توقع رکھنا کہ اب آپ اسی طرح ہم سے ملیں یا ان اطراف کا قصد
کریں جیسا کہ وعدہ کیا تھا۔ اب صحیح نہیں۔ خط کی تحریر بھی بہت روکھی
اور خود دارانہ ہے۔"

یورپ سے اگر یورپ میں اقبال اور عطیہ کی ملاقاتوں کی طرف اشارہ
سمجھا جائے تو رقابت کا معمولی سا احساس ہوتا ہے لیکن جب ۱۹۰۸ء کے بعد کے
شبلی اور اقبال کے خوشگوار تعلقات کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ احساس ختم
ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شبلی تو عطیہ کی شادی کے بعد
بھی اس سے اور اس کے خاوند سے خوش اسلوبی سے ملتے رہے ہیں تو پھر کسی قسم کا
رقابت کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اصل صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں
عظیم شخصیتوں کے سامنے ان کے عظیم مقاصد تھے۔ اور ان مقاصد کی خاطر پبلک
لائف میں اپنا وقار اور معیار قائم رکھنے کے لئے وہ ہر قسم کے لگاؤ کو قربان
کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، اس میں شک نہیں کہ پیشرو کو بھی عطیہ نے متاثر
کیا اور پیرو کو بھی لیکن دونوں کی واحد منزل مقصود چونکہ عطیہ نہیں تھی۔ اس
لئے دونوں اس واقعہ کو ایک معمولی قصہ ماضی سمجھتے ہوئے اپنی ملی ذمہ داریاں
نبھانے میں مصروف رہے۔

۱۱۔ شبلی کے تربیت یافتہ سید سلیمان ندوی ان چند علماء میں سے ایک
ہیں جو شبلی اور اقبال دونوں کے معتمد اور مشیر رہے۔ اس کا بین ثبوت
وہ متعدد خطوط ہیں جو ان دونوں کے سلیمان ندوی کے نام ملتے
ہیں۔

۱۲۔ گزر اوقات کے لئے دونوں نے معلمی کا پہلے اور وکالت کا بعد میں سہارا لیا لیکن دونوں کا زیادہ وقت تصنیف و تالیف کے مشاغل میں گزرا۔

۱۳۔ دونوں نے نجی اور ملی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ریاست حیدرآباد ریاست بہاولپور اور ریاست بھوپال سے مالی امداد کی توقعات وابستہ کیں۔ لیکن جو کسی حد تک حسب منشا صرف ریاست بھوپال سے پوری ہو سکیں۔

۱۴۔ دونوں حکومت نے خطابات سے نوازا۔ شبلی ۱۸۹۳ء میں "شمس العلماء" بنے اور اقبال ۱۹۲۳ء میں "سر" بنائے گئے لیکن خطابات کی بارش سے ان کے سینوں میں عشقِ اسلام کی گرمی کم نہ ہوئی۔ وہ حکومت اور انگریز پر تنقید کرتے رہے۔

۱۵۔ دونوں کو دار المصنفین سے دو بلند پایہ سوانح نگار ملے۔ مولانا کی سوانحعمری سید سلیمان ندوی نے لکھی اور اقبال کی زندگی اور شاعری کو عبدالسلام ندوی نے "اقبال کامل" میں پیش کیا۔

ب۔ اجتماعی زندگی :۔

۱۔ دونوں نے برِصغیر کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے علاوہ سیاسی تحریکوں میں بھی حصہ لیا۔

۲۔ دونوں برصغیر کے علاوہ دوسرے ملکوں کے بالعموم اور اسلامی ممالک کے بالخصوص سیاسی حالات میں دلچسپی لیتے رہے۔

۳۔ دونوں کو غیر ممالک میں جانے کے مواقع ملے۔

۴۔ دونوں جمال الدین افغانی کی تحریک اتحادِ اسلامی اور انگریز دشمنی کو سراہنے والے تھے ہیں سمجھتا ہوں کہ شبلی اور اقبال کو سرسید کے حلقہ اثر سے آزاد

قرار دینے کے لئے یہی ایک پہلو کافی ہے۔ کیونکہ جملہ مورخین کا اس بات پر اتفاق
ہے کہ جمال الدین افغانی اور سر سید کے سیاسی نظریات ایک دوسرے سے
بالکل مختلف تھے۔ شبلی اور اقبال چونکہ ہر بات کو مذہب کے حوالے سے
دیکھنے کے قائل تھے اور سیاست بھی مذہب سے الگ نہیں سمجھتے تھے۔ اس
لئے ان کی زندگی کے ہر شعبے پر ان کے سیاسی نظریات کا اثر تھا۔

۵۔ شبلی اور اقبال دونوں مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنانے کے خواہشمند تھے
شبلی اور عطیہ فیضی تو شروع میں مسلم کو ایک ڈھکوسلہ سمجھتے تھے۔ عطیہ فیضی
نے شبلی کو جب ایک خط میں یہ لکھا:۔

"کانفرنس (یعنی علی گڑھ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) اور مسلم لیگ
سخت ڈھکوسلے ہیں۔ بزدل لوگوں کے .... انگریز جس قدر مسلمانوں
کو بناتے ہیں اسی قدر یہ بنتے جاتے ہیں۔

شبلی عطیہ کی اس رائے سے بہت خوش ہوئے اور مہدی حسن کو یہ
اطلاع دی کہ: "میں تو بہ خدا ان فقروں پر ایمان رکھتا ہوں، گو
کافر کے منہ سے نکلے ہیں"۔

"کافر کی بات پر ایمان لانے کے باوجود ملت کے مفاد کی خاطر شبلی کو بھی
اور اقبال کو بھی کانفرنس اور مسلم لیگ کا بعض معاملات میں ہمنوا ہونا پڑا۔ اس
مرحلے پر اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کا وہ بیان قابل توجہ ہے۔ جو ان
کی تصنیف "مے لالہ فام" میں اقبال کے برل ازم کو سر سید کی قدامت پسندی
جمال الدین افغانی کے پان اسلام ازم اور مولانا شبلی کے ریڈیکل ازم کا مرکب
قرار دیتے ہوئے بدیں الفاظ ملتا ہے:۔

"مجھے مولانا شبلی کے ریڈیکل ازم نے بے حد متاثر کیا۔ ان کی توجہ

کا مرکز دراصل مسلم کاشتکار تھے۔ یوں دکھائی دیتا ہے، جیسے ان کے ذہن میں اسلام کا تصور بحیثیت ایک فلاحی ریاست موجود تھا۔ اسی خیال کے پیشِ نظر انہوں نے ۱۹۱۲ء میں "مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" کے زیرِ عنوان سیاسی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ جس میں مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ پر کڑی نکتہ چینی کی۔ اس زمانے میں مسلم لیگ عوامی جماعت نہیں تھی بلکہ مفاد پرستوں کا ایک گروہ اس پر قابض تھا۔ جس نے اسے حکومت سے مراعات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا۔ محولہ بالا مضامین میں سے ایک میں شبلی لکھتے ہیں۔

"اس موقع پر پہنچ کر دفعتہً ہمارے سامنے ایک چیز نمودار ہوتی ہے۔ مسلم لیگ یہ عجیب الخلقت کیا چیز ہے! کیا یہ پالیٹیکس ہے؟ خدانخواستہ نہیں۔ انڈین کانگرس ہے؟ نہیں۔ کیا ہاؤس آف لارڈز ہے؟ ہاں سوانگ تو اسی قسم کا ہے . . . . . پالیٹیکس کی بحث میں ہمارا سب سے بڑا اور مقدم کام یہ ہے۔ کہ یہ سمجھا دیا جائے کہ مسلم لیگ نہ آج بلکہ ہزار برس کے بعد بھی پالیٹیکس نہیں بن سکتی جس گروہ کے نزدیک صرف زبان سے کوئی لفظ بول دینا پالیٹیکس ہے، وہ کیونکر پالیٹکس کی حقیقت سمجھ سکتا ہے۔ پالیٹیکس ایک سخت قومی احساس ہے۔ اس کا ظہور بیگار کے طور پر نہیں ہوتا۔ یہ احساس جب دل میں پیدا ہوتا ہے تو دل و دماغ اور اعصاب تصرف کا رہو جاتے ہیں۔ لیگ کا طرزِ عمل بتاتا ہے کہ اس کی آواز ایک مصنوعی اور خارجی آواز ہے۔ کیا ایک معزز رئیس، ایک بڑا زمیندار

ایک حکام رس دولتمند کسی تحریک کے لئے اپنی جائیداد، اپنی حکام رسی، اپنی فرضی آبرو کو نقصان پہنچانا گوارا کر سکتا ہے!....

بہ ضرورت مسلم لیگ سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ مالی حالت کے لحاظ سے آپ کی ہستی کیا ہے! تو جواب ملے گا۔ ایک خاص دست کرم اس بنا پر مسلم لیگ کے تمام منصوبے تمام تجاویز، تمام ارادے اسی دست کرم کے اشاروں پر حرکت کرتے ہیں۔

شبلی نے ۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ کو جس طرح عوامی جماعت بنانے کا احساس دلایا تھا، بالکل اسی طرح اقبال ۱۹۳۷ء میں قائداعظم کو ایک خط میں بدیں الفاظ یہ احساس دلاتے ہیں۔

" مجھے کامل یقین ہے کہ اسلامی ہند کی نزاکتِ حالات کا آپ کو پورا پورا احساس ہے۔ لیگ کو انجام کار یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ وہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندہ بنی رہے یا مسلمان عوام کی نمائندگی کا حق ادا کرے جنہیں ابتک نہایت بجا طور پر لیگ میں کوئی وجہ دلکشی نظر نہیں آئی۔ میرا ذاتی خیال بھی ہے کہ کوئی سیاسی جماعت، جو عام مسلمانوں کی بہبودی کی ضامن نہ ہو، عوام کے لئے باعث کشش نہیں ہو سکتی۔

روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے مسلمان سمجھتے ہیں کہ ان کے افلاس کی ذمہ داری ہندو کی ساہوکاری و سرمایہ داری پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن یہ احساس کہ ان کے افلاس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی حصہ دار ہے، اگرچہ ابھی قوی نہیں ہوا، لیکن یہ نظریہ بھی پوری قوت و شدت حاصل کر کے رہے گا۔

جواہر لال کی منکرِ خدا اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکے گی۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے

کے لیے مسلم لیگ کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس
کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان عوام پہلے کی
طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے
نفاذ میں اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اور فقہ اسلامی کا مطالعہ مقتضیاتِ
حاضرہ کے پیشِ نظر دوسرے مسائل کا حل بھی پیش کر سکتا ہے۔ شریعت
اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ
اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو
کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔ . . . ہندو دھرم
معاشی جمہوریت (سوشل ڈیماکریسی) اختیار کر لیتا ہے تو خود ہندو
دھرم کا خاتمہ ہے۔ اسلام کے لیے سوشل ڈیماکریسی کی کسی موزوں شکل
میں ترویج جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو، حقیقت
میں کوئی انقلاب نہیں، بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا
ہو گا۔"

مسلم لیگ کی تاریخ شاہد ہے کہ شبلی اور اقبال کے خدشات بالکل درست ثابت
ہوئے۔ پاکستان کے حصول کے لیے مسلم لیگ نے جب عوام کو ساتھ لیا تو پاکستان قائم
کرنے میں کامیاب ہو گئی لیکن قیام پاکستان کے بعد جب عوام سے رشتہ کٹ گیا اور مسلمانوں
کو افلاس سے نجات نہ مل سکی تو ملک بھی پچیس سال کے بعد دو حصوں میں تقسیم ہو گیا
اور مسلم لیگ مردہ جماعتوں میں شمار ہونے لگی۔ اس کے برعکس جب پیپلز پارٹی نے
نے روٹی کے مسئلہ کو کماحقہٗ اہمیت دی اور اقبال کے سوشل ڈیموکریسی والے تصور
کو شریعت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے بہت بڑی حد تک اپنا لیا تو ایک
کامیاب، زندہ اور عوامی جماعت بن کر سامنے آگئی۔

۶۔ دونوں نے پاکستان کے بانی قائد اعظم کے ساتھ کام کیا۔ شبلی نے وقفِ اولاد بل کے لئے ان کی مدد حاصل کی اور اقبال نے مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں ان کا ساتھ دیا۔

۷۔ دونوں نے برصغیر کی مختلف علمی، ادبی اور سماجی انجمنوں یا اداروں کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ مثلاً انجمن حمایت اسلام لاہور، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور آل انڈیا مسلم کانفرنس سے مختلف ادوار میں دونوں کی وابستگی رہی۔ اس کے علاوہ شبلی نے اگر انجمن ترقی اردو، انجمن خدام الدین، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دار المصنفین اعظم گڑھ کے لئے قابلِ قدر کام کیا تو اقبال نے جمعیت مرکزیہ تبلیغ السلام انبالہ، انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ لاہور، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور اور پٹھانکوٹ کے ادارہ "دار السلام" کے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں دستِ راست ہونے کا ثبوت دیا۔

۸۔ دونوں کے اکبر الٰہ آبادی سے روابط تھے، دونوں اکبر کی طرح مغربی تہذیب پر طنز کرنے والے تھے۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "شبلی اپنی صدی میں روایات قدیم کے غالباً سب سے بڑے اور سب سے پُرجوش مبلغ تھے، ان کے بعد روایاتِ ماضی کے قریباً سب علمبرداروں نے ان کی پیروی کی۔ ان میں اکبر اور اقبال بھی شامل ہیں۔"

ج۔ نظریات :۔

۱۔ دونوں تمام مسائل کا ضامن قرآنِ حکیم کو سمجھتے تھے اور رسولِ خدا کے عاشق تھے۔

۲۔ علمی نقطۂ نظر سے دونوں مشرق اور مغرب سے استفادہ کے حق میں تھے

لیکن دونوں کا رجحان مشرق کی طرف زیادہ تھا۔ وہ مغرب سے مرعوب نہیں تھے۔ مشرقی روایات کے دلدادہ تھے۔

۳۔ دونوں " ادب برائے ادب " کے نہیں بلکہ " ادب برائے زندگی " کے نظریاتی اور عملی صورت میں قائل تھے۔

۴۔ دونوں اردو زبان کی ترقی کے خواہاں تھے۔ اور اس کے لئے کوشش کرتے رہے۔

۵۔ دونوں جلوت پسند تھے، دونوں کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔

۶۔ بنیادی طور پر دونوں کا اندازِ فکر اور طرزِ عمل ریسرچ سکالروں جیسا تھا حقائق تک پہنچنے کے لئے وہ دوسروں کو بھی یہی انداز اختیار کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ نادر اور نایاب کتابوں کے متعلق جتنے حوالے شبلی اور اقبال کے مکتوبات میں ملتے ہیں۔ شاید ہی کسی دوسرے کے مکاتیب میں ملیں۔

۷۔ دونوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ابلاغ و اظہار کے مختلف طریقے اختیار کئے، شعر کہے، مضامین لکھے کتابیں لکھیں اور تقریریں کیں۔

۸۔ دونوں فارسی شاعری کے دلدادہ تھے لیکن ملت کے مفاد کی خاطر اس کے بعض پہلوؤں سے متنفر بھی تھے۔

۹۔ دونوں تن کی دولت سے بے نیاز اور من کی دولت کے شیدائی تھے۔

۱۰۔ دونوں بنیادی طور پر اپنا پورا وقت اور اپنے تمام وسائل تصنیف و تالیف کے پروگرام کی تکمیل کے لئے وقف کر دینا چاہتے تھے لیکن مجبوراً انہیں دوسرے مشاغل اختیار کرنے پڑے۔

۱۱۔ دونوں مولانا روم کے مداح تھے۔

د ۔ اقبال کی تصنیفات پر شبلی کے اثرات :۔

۱۔ اقبال کی تصنیف "علم الاقتصاد" کے بعض حصوں پر شبلی نے نظر ثانی کی۔

۲۔ شبلی نے سوانح مولانا روم پہلے لکھی اور اقبال نے اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی، دونوں مثنویاں بعد میں نظم کیں۔ ان مثنویوں میں مولانا روم کا اثر نمایاں ہے۔ اسے توارد کہئے یا پیروی کا نتیجہ کہ مولانا روم کے جن تین شعروں سے اسرارِ خودی کا آغاز ہوا ہے، ان میں سے دو شعر شبلی سوانح مولانا روم لکھتے ہوئے منتخب کلام میں شامل کر چکے تھے۔

۳۔ شبلی کی تصانیف علم الکلام، سوانح مولانا روم، الکلام اور شعر العجم سے جو سلسلہ خیال سامنے آتا ہے، اقبال کی تصانیف فلسفہ عجم، پیام مشرق اور زبورِ عجم اسی کی کڑیاں نظر آتی ہیں۔ اقبال نے اپنی تصانیف میں بعض مقامات پر شبلی اور اس کی تصانیف سے حوالے دے کر فائدہ اٹھایا ہے۔ مثلاً فلسفہ عجم میں ابن مسکویہ کے نظریات بیان کرتے ہوئے "الکلام" میں سے ایک اقتباس شامل کیا گیا ہے۔

۴۔ شبلی کی سیرت النبی اور اقبال کی ارمغانِ حجاز۔ دونوں سے عشقِ رسول کا اظہار ہوتا ہے اور اس تمنا کی ترجمانی ہوتی ہے کہ خاتمہ بالخیر ہو۔

مجمل صورت میں شبلی اور اقبال کی زندگی کے جو یکساں پہلو پیش کئے گئے ہیں اور ان کے نظریات اور ان کی تصانیف میں یک رنگی کی جو صورتیں نمایاں کی گئی ہیں۔ ان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں شبلی کو پیشرو اور اقبال کو اس کا پیرو کہنا مناسب سمجھتا ہوں۔ یہ صورت خلافِ توقع نہیں ہے کیونکہ بقول کسے ؎

دو رہرو کہ بیک راہ روند و یک سمت   عجب نہ باشد اگر افتند پے در پے . . .

شبلی کی راہ پر اقبال کب اور کیسے گامزن ہوئے! اقبال کی تصنیف علم الاقتصاد

گے دیباچے میں اس سوال کے جواب کی طرف بدیں صورت اشارہ ملتا ہے :۔

"اس دیباچے کو ختم کرنے سے پیشتر میں استاذی المعظم حضرت قبلہ آرنلڈ صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج، لاہور کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنہوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی تحریک کی۔ میں استاذی جناب قبلہ لالہ جیارام صاحب ایم۔ اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور اپنے عزیز دوست اور ہم جماعت مسٹر فضل حسین بی۔ اے کینٹ بیرسٹرایٹ لاء کا بھی مشکور ہوں، جنہوں نے اپنے مجھے نہ صرف اپنے بیش قیمت کتب خانوں کی کتابیں ہی عنایت فرمائیں بلکہ بعض مسائل کے متعلق نہایت قابل قدر مشورات بھی دیئے۔ اس کے علاوہ مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدظلہ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابلِ قدر اصلاح دی۔"

"علم الاقتصاد" کا سالِ تصنیف چونکہ ۱۹۰۳ء ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ اسی سال یا اس سے دو سال پہلے کے عرصہ میں کتاب کے بعض حصوں کی اصلاح کا مرحلہ طے ہوا ہو۔ دو سال پہلے کی بات میں نے اس لئے کہی ہے کہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے یونیورسٹی اور نٹیل کالج لاہور کا ریکارڈ دیکھنے کے بعد اپنے ایک مضمون میں یہ بیان کیا ہے کہ اس تصنیف کا ذکر یونیورسٹی اورنٹیل کالج کی سالانہ رپورٹ بابت سال ...

۱۹۰۱-۲ء میں ملتا ہے۔

کیا ۱۹۰۱ء سے پہلے کبھی شبلی اور اقبال کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی یا کسی قسم کا رابطہ قائم ہوا تھا؟ کیا "علم الاقتصاد" پر اصلاح کے سلسلہ میں دونوں کی کبھی ملاقات ہوئی تھی۔

گو ان سوالوں کا جواب مثبت یا منفی صورت میں مجھے نہیں مل سکا۔ لیکن بالواسطہ رابطے کے کچھ امکانات کی طرف ضرور اشارے ملتے ہیں۔ شبلی اورنٹیل کالج

لاہور کے پروفیسر مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے عربی ادبیات کا درس لینے کے لئے ۱۸۷۶ء میں لاہور آئے تھے۔ "یادگارِ شبلی" کے مصنف ایس۔ ایم اکرام لکھتے ہیں کہ:۔

"انہوں نے لاہور کا سفر ایک اضطراری جذبہ کے تحت یعنی بغیر کسی پیش بندی اور ضروری انتظامات کے کیا تھا۔ نہ اورینٹل کالج میں داخلہ لیا تھا اور نہ مولانا فیض الحسن صاحب سے کوئی خط وکتابت کی تھی۔ یہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ نہ صرف کالج میں داخلہ ناممکن ہے۔ (اگر ان کا ارادہ تھا) بلکہ کالج سے باہر کے اوقات میں بھی مولانا کے درس میں شرکت کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن ان کا عزم راسخ ان مشکلات پہ غالب آیا۔ آخر یہ طے ہوا کہ مکان سے کالج تک کی مسافت طے کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے۔ اس میں مولانا درسِ ادبیات لیا کریں۔"

چنانچہ اس تجویز کے مطابق موسم گرما کی تعطیلات تک چند ماہ کے لئے درس وتدریس کا یہ انوکھا اور قابلِ قدر سلسلہ جاری رہا۔ کالج بند ہوا تو استاد اور شاگرد سہارنپور پہنچ گئے، وہاں کچھ عرصہ کے لئے ساتھ رہے۔ حیاتِ شبلی کے مصنف سید سلیمان ندوی کہتے ہیں کہ مولانا فیض الحسن کا درس "قلیل المدت" ہونے کے باوجود شبلی کے لئے بہت موثر ثابت ہوا اور اسی درس نے مولانا میں عربی علم ادب کا صحیح مذاق حدِ کمال کو پہنچا دیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ شبلی کی اورینٹل کالج میں ۱۸۷۶ء میں غیر رسمی آمد کے بیس سال بعد ایک ایسے شخص نے اورینٹل کالج میں قدم رکھا جو شبلی کی پیدائش ... ۱۸۵۷ء میں) سے بیس سال بعد (۱۸۷۷ء میں) پیدا ہوا تھا۔ جس کے اجداد

شبلی کے بزرگوں کی طرح غیر مسلم تھے۔ لیکن باعزت نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کے گھر کا ماحول شبلی کے گھر کے ماحول کی طرح مذہبی تھا جس طرح شبلی کو لاہور پہنچنے سے پہلے مولانا فاروق چریا کوٹی جیسے عالم شفیق، جوہر شناس اور حوصلہ افزا استاد کی رفاقت نصیب ہوئی تھی اسی طرح اسے لاہور میں آنے سے پہلے علامہ میر حسن جیسے فاضل، ہمدرد، قدردان اور ہمت بڑھانے والے استاد سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ شخص چند سال کے بعد شبلی کی وساطت سے ملت کی طرف سے ترجمانِ حقیقت کا لقب حاصل کرنے کا مستحق قرار پایا۔ ۱۸۹۶ء میں اورینٹل کالج میں کام کرنے والا اور شبلی سے تعلق رکھنے والا کوئی استاد ۱۸۹۵ء تک دعیق اور اورینٹل کالج میں اقبال کی آمد تک، ممکن ہے کہ نہ رہا ہو لیکن اورینٹل کالج اور اسکے شعبہ عربی کی وہ روایات یقیناً اقبال تک پہنچی ہوں گی۔ جن کا شبلی کے استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے گہرا تعلق تھا۔ ۱۸۸۶ء کے بعد پنجاب میں شبلی کی دوبارہ آمد کے متعلق ان کے مکاتیب میں حوالے ملتے ہیں۔ ایک حوالہ کے مطابق وہ ۱۸۹۸ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے لاہور آئے دوسرے حوالہ کے مطابق ۱۹۰۲ء میں امرتسر میں منعقد ہونے والے ندوۃ العلماء کے جلسہ میں شریک ہوئے۔

اس کے علاوہ اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ شبلی کے اشعار اور ان کے نثر پارے ان رسائل میں چھپ رہے تھے، جن میں ۱۹۰۰ء کے قریب کے زمانہ میں اقبال کی تحریریں چھپنے لگی تھیں۔ اس سلسلہ میں "مخزن" لاہور خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ مخزن کے مدیر شیخ عبدالقادر اور برصغیر کے مشہور عالم اور رہنما مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے تعلقات بھی اسی دور میں شبلی اور اقبال کے ساتھ استوار ہوئے پھر جس دور سے "علم الاقتصاد" کے معرضِ اشاعت

میں آنے کا تعلق ہے۔ اس میں شبلی حیدر آباد دکن میں تھے اور شاعری میں اقبال کے استاد داغ سے ان کی ملاقاتیں ہوتی تھیں بمکتوبات اقبال سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کی اس دور میں داغ سے خط وکتابت بھی تھی۔ شبلی اور اقبال اپنی اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں داغ کے انداز میں غزلیں بھی کہتے رہے ہیں۔ شروع میں شبلی کا تخلص نسیم تھا۔ بعد میں شبلی اور کشاف کے نام سے بھی نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ اب شبلی کے یہ اشعار دیکھیے۔

وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں،
سیانے ہوں گے تو "ہاں" بھی ہوگی ابھی تو سن ہے "نہیں نہیں" کا

بخودی وصل کی خط کب مجھے لینے دیتی
وہ جو آتے بھی تو میں آپ سے باہر ہوتا

بست تھی اس کی کمر پر تو نے ثابت کر دیا
واہ واہ نسیم کیا تیرے بیان میں زور ہے

بزم میں ہر سادہ رُخ تیرے حضور
صورتِ آئینہ حیراں رہ گیا

ہم نے بھی حضرتِ شبلی کی زیارت کی تھی
یوں تو ظاہر میں مقدس تھا پہ شیدائی تھا

اقبال پر داغ کا اثر ان اشعار میں نمایاں ہے:۔

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تیری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

ہم موت مانگتے ہیں وہ گھبرائے جاتے ہیں
مجھ کسی نے اور ہی معنی وصال کے

تصویر میں نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب
عاشق ہوئے تھے تم تو کسی بے مثال کے

رند کہتے ہیں بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی تو ہے منصور کا ثانی

اس قسم کے اتفاقات، تعلقات اور اس طرح کی مماثلتوں کا جائزہ لینے سے ایک ایسی صورت سامنے آتی ہے کہ جس نے بلاشبہ دونوں عظیم شخصیتوں کو یکے بعد دیگرے متاثر کیا اور ایسی راہ پر ڈال دیا کہ جس پر چلتے ہوئے ایک لیڈر بن گیا اور دوسرا ایک

اس طرف اقبال نے خود "علم الاقتصاد" کے دیباچے میں، اشارہ کیا ہے۔ اس رفاقت نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ کبھی کبھی صنم خانے سے بھی کعبے کو پاسباں مل جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر میرا اشارہ پروفیسر آرنلڈ کے شاہکار PREACHING OF ISLAM اور شبلی اور اقبال کی ان علمی اور ادبی تصانیف کی طرف ہے جن کے محرک کسی نہ کسی صورت میں آرنلڈ تھے۔ آرنلڈ کی نسبت شبلی خود کہتے ہیں۔ ع

آرنلڈ آں کہ رفیق است و ہم استاد مرا

دونوں میں رفاقت کی پہلی صورت ۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۸ء تک علیگڑھ کالج کی بدولت پیدا ہوئی جس میں دونوں پڑھانے تھے علمی گروہ سے جب آرنلڈ رخصت ہوئے تو شبلی نے یہ الوداعی قطعہ کہا :۔

آرنلڈ آں کہ درپی شہر و دیار آمد و رفت — دلبرے بود کہ مارا بکنار آمد و رفت

آمد آں گونہ کالج کہ بہ گلزار نسیم — رفت زاں سان کہ تو گوئی کہ بہار آمد و رفت

رفاقت کا دوسرا موقع اس وقت ملا، جب ۱۹۰۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبے کے طور پر انجمن ترقی اردو کی بنیاد رکھی گئی اور اس انجمن کے صدر پروفیسر آرنلڈ اور سیکریٹری شبلی مقرر ہوئے۔ شبلی نے اپنے رفیق کار کو اپنا استاد اس لئے کہا ہے کہ علمی مسائل کے متعلق مشورے حاصل کرنے کے علاوہ انہوں نے فرانسیسی پروفیسر آرنلڈ سے پڑھی تھی۔ تیسرا پہلو جس کا شبلی نے ذکر نہیں کیا، یہ ہے کہ آرنلڈ کو عربی شبلی نے پڑھائی تھی۔ اس طرح سے دونوں کے تعلقات گوناگوں اور بہت گہرے تھے۔ ان تعلقات کی وجہ سے ہی بقول شیخ محمد اکرام (مصنف یادگار شبلی) جب پروفیسر آرنلڈ ۱۹۰۴ء میں ہندوستان چھوڑ کر ولایت کو چلے تو اس زمانے میں مولانا حیدرآباد میں ملازم تھے، وہ انہیں خدا حافظ کہنے حیدرآباد سے بمبئی آئے اور باوجودیکہ وہ ان دنوں روپے کے سخت حاجتمند تھے، ایابی اخراجات کے علاوہ انہوں

نے پروفیسر آرنلڈ کے دوامی تحفہ پر پچاس روپے خرچ کئے"۔

شبلی کو آرنلڈ سے جو لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ اس خط سے بھی بخوبی ہوتا ہے جو ۱۳ جولائی ۱۸۹۹ء کو ریاست بھوپال کے نواب سید علی حسن خاں کو لکھا تھا اس خط سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ شبلی کی نظر صرف اندرون ملک کی علمی سرگرمیوں پر ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ دوسرے ملکوں کے علمی معاملات سے بھی وہ آگاہ رہتے تھے۔ بالخصوص علوم شرقیہ کے سلسلے میں۔ محولہ بالا خط میں لکھتے ہیں:۔

"آپ کو معلوم ہوگا کہ یورپ میں علوم شرقیہ کے علما کا ایک مجمع ہے جس کو اورینٹیل کانفرنس کہتے ہیں۔ یہ نہایت معزز کانفرنس ہے اور تمام یورپ و مصر و شام کے علما جمع ہوتے ہیں۔ اس کا اجلاس اٹلی میں ہے ریاست حیدرآباد نے سید علی بلگرامی کو اس کی شرکت کے لئے بھیجا ہے۔ اور پنجاب گورنمنٹ نے ہمارے آرنلڈ کو۔"

آخری جملے کا پس منظر یہ ہے کہ علیگڑھ کی طویل رفاقت اور دلی قربت کی وجہ سے شبلی آرنلڈ کو اپنا سمجھتے تھے۔ لیکن ۱۸۹۸ء میں آرنلڈ چونکہ علیگڑھ چھوڑ کر گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہو گئے تھے اس لئے پنجاب کا حوالہ شبلی نے مناسب سمجھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو چونکہ اقبال کا ایران شناسی، قرآن و وحی اور عشق رسول کی اس راہ پر چلنا منظور تھا جس پر شبلی گامزن تھے۔ اس لئے قدرت نے شبلی کے ہم خیال آرنلڈ کو مناسب وقت پر لاہور بھیج دیا جس طرح علیگڑھ میں انھوں نے شبلی کے استاد، رفیق کار اور مشیر کی صورت میں کام کیا تھا۔ اسی طرح لاہور اور بعد ازاں یورپ میں اقبال کا ان مختلف حیثیتوں میں ساتھ دیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب آرنلڈ ۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پہنچے تو اقبال اس وقت ایم۔ اے فلسفہ کے طالبعلم تھے۔ ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے

کرنے کے بعد اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہو گئے اور ۱۹۰۳ء تک اس حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس عرصہ میں چند مہینوں کے لئے آرنلڈ اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی مقرر ہوئے۔ اس طرح پہلے شاگرد اور پھر رفیق کار کی صورت میں یکجا کام کرنے کے بعد اقبال کو شبلی کی طرح سے ہی آرنلڈ کے ساتھ غیر رسمی عقیدت ہو گئی تھی۔ اس کی مظہر وہ مشہور نظم ہے جو بانگ درا میں "نالۂ فراق" کے عنوان سے شامل ہے۔ اس نظم کے آخری بند میں اقبال پنجاب سے باہر جانے کا ارادہ اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

کھول دے گا دستِ وحشت عقدۂ تقدیر کو　　توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو　　کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو

تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا

تاریخ شاہد ہے کہ اقبال اپنے عزم کی تکمیل میں کامیاب رہے۔ پنجاب کی زنجیر توڑ کر وہ ۱۹۰۵ء میں یورپ میں پہنچ گئے اور اپنے شفیق استاد پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے یورپین اساتذہ کے مشوروں کے مطابق فلسفے اور مذہب کی دنیا کے حقائق معلوم کرنے کے لئے تحقیق اور تنقید کی اس راہ پر چل پڑے جس پر مولانا شبلی پہلے ہی اپنے ملک کے اندر گامزن تھے۔ اس راہ پر چلتے ہوئے شبلی جو نقشِ قدم چھوڑتے گئے۔ اقبال کے لئے بلاشبہ وہ نشانِ راہ کی صورت میں قابلِ توجہ بنتے رہے لیکن ایک اندھے مقلد کی صورت میں نہیں۔ وہ ان نقوش کو صرف دیکھتے اور سراہتے نہیں تھے۔ ایک ریسرچ سکالر کی حیثیت سے ان کا بنظرِ تحقیق جائزہ لیتے تھے۔ مثلاً ۲۲ ستمبر ۱۹۳۹ء کو سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:۔

"الکلام (یعنی علم کلام جدید) کے صفحہ ۱۱۲-۱۱۳ پر مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے الحجۃ البالغہ (صفحہ ۱۲۳) کا ایک فقرہ عربی میں نقل کیا ہے جس کے مفہوم کا خلاصہ انہوں نے اپنے الفاظ میں بھی دیا ہے۔ اس عربی فقرے کے آخری حصے کا ترجمہ یہ ہے۔

"اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان طریقہ کوئی نہیں کہ شعار، تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کے عادات کا لحاظ کیا جائے.... مہربانی کر کے یہ فرمایئے کہ مندرجہ بالا فقرہ میں لفظ شعار سے کیا مراد ہے؟"

اس خط کے جواب میں سید سلیمان ندوی نے جو کچھ لکھا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اس سے مطمئن نہ ہو سکے۔ اس لئے ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء کو دوبارہ اس سلسلہ میں انہیں لکھتے ہیں:۔

"لفظ شعار کے معنی کے متعلق پورا اطمینان آپ کی تحریر سے نہیں ہوا۔ کیا کسی جگہ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ البالغہ میں شعائر کی یہ تشریح کی ہے جو آپ نے کی ہے۔ دراصل غرض یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اسی فقرہ میں لفظ ارتفاقات استعمال کیا ہے۔ مولانا شبلی نے ایک جگہ اس کا ترجمہ انتظامات اور دوسری جگہ مُسلمات کیا ہے۔ اگر دونوں ترجمے سے یہ نہیں کھلتا کہ اصل مقصود کیا ہے۔"

ان خطوط کے پیشِ نظر یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ اقبال نہ تو شبلی کی تحریر سے مطمئن ہوئے اور نہ ہی ان کے شاگردِ رشید اور دستِ راست سید سلیمان ندوی سے۔ حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی۔ مثلاً ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:۔

"آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے جس کے لئے نہایت ممنون ہوں مجھے اس سے بہت فائدہ پہنچے گا۔ میں چند روز کے لئے شملہ گیا تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ آپ بھی وہاں

تشریف رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مجھے ایک ضروری کام درپیش تھا، جس میں مصروفیت رہی، البتہ معنوی طور پر آپ کی صحبت رہی کیونکہ رات کو سیرت نبوی کا مطالعہ رہتا تھا مولانا مرحوم (شبلی) نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس کا صلہ دربارِ نبوی سے عطا ہوگا۔"

اقبال کی نظر میں شبلی کی تصانیف کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ وہ خود بھی ان کا مطالعہ کرتے تھے اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے ظہور الدین مہجور کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"ہاں تذکرہ کشمیر لکھتے وقت مولانا شبلی کی شعر العجم آپ کے پیشِ نظر رہنی چاہیے۔ محض حروف تہجی کی ترتیب سے شعراء کا حال لکھ دینا کافی ہوگا۔ کام کی چیز یہ ہے کہ آپ کشمیر میں فارسی شعر کی تاریخ لکھیں :۔

کیا ان جملوں کا یہ مطلب سمجھنا غلط ہوگا کہ اقبال خود گائیڈ کی حیثیت سے مہجور کو شبلی کی شعر العجم سے گائیڈ کا کام لینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ بالفاظِ دیگر شعر العجم کو ایک قابلِ تقلید نمونہ قرار دے رہے ہیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ اقبال اپنے آپ کو ذہنی طور پر شبلی کے بہت قریب سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ ظاہری فاصلے بھی بہت کم کر دینا چاہتے تھے لیکن بد قسمتی سے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس خواہش کا اظہار ہمیں سید سلیمان ندوی کے نام ۱۳ر نومبر ۱۹۱۶ء کے خط میں اس طرح ملتا ہے :۔

"مولانا مرحوم کی زندگی میں میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مولانا مرحوم پنجاب میں مستقل طور پر اقامت گزیں ہو جائیں مگر مسلمان امرا میں مذاقِ علمی مفقود ہو چکا ہے۔ میری کوشش بار آور نہ ہوئی اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ دارالمصنفین کے کام میں برکت دے اور آپ کا وجود مسلمانوں کے لئے مفید ثابت کرے .. مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا اور جو چند نظمیں انہوں نے لکھی تھیں، وہ نہایت مقبول ہوئیں. غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھئے۔"

محولہ بالا خط کے آخری تین جملوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کی اپنی تاریخی نظمیں بھی شبلی کی تاریخی نظموں کے سلسلہ کی کڑیاں ہیں کیونکہ اقبال جیسے سمجھدار اور دیانتدار شیر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ سید سلیمان ندوی کو تو ایک مستحسن سلسلے کو جاری رکھنے کا مشورہ دیں اور خود دور رہیں. خاص طور پر اس صورت میں کہ جب ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں دونوں کے دل بالکل ایک ہی طرح سے دھڑکتے اور اپنے جذبات کو شعروں کے سانچے میں ڈھالتے نظر آتے ہیں۔ یہ دور ملت اسلامیہ کی تاریخ کا بہت ہی نازک دور تھا۔ "یادگار شبلی" کے مصنف شیخ محمد اکرام اس دور کے حالات اور ان کے شبلی پر اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اس زمانے میں ہندوستان سے بہت دور بعض ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے مولانا کو بے چین و بے قرار کر دیا اور اسلامی ہندوستان کی سیاسیات کا بھی ایک عرصے کے لئے رخ بدل دیا ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر ۱۹۱۲ء میں بلقان کی عیسائی ... ریاستوں نے خود ترکی پر حملہ کر دیا. ترکی سے عام طور پر برطانوی حکومت کے تعلقات دوستانہ رہے تھے، برطانیہ کو ایشیا میں روس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ رہتا تھا۔ اس لئے وہ مغربی ایشیا میں

روس کے قدیمی حریف ترکی کی مدد کرتی تھی۔ اسی مقصد کے لیے انیسویں صدی میں برطانیہ نے روس کے خلاف جنگ کرتے ہیں حصہ لیا۔ اور عام طور پر ترکوں کی حمایت کی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر انیسویں صدی میں ترکی کو برطانیہ کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو کب کا روس کے پنجہ آز کا شکار ہوچکا ہوتا۔ لیکن لبرل پارٹی کے سرگروہ مسٹر گلیڈ اسٹون ایک متعصب عیسائی تھے، وہ اور ان کی پارٹی ترکی کے خلاف تھی۔ اس کے علاوہ جب بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں کو جرمنی کی طرف سے ایک خطرہ عظیم پیدا ہوگیا۔ تو وزیر خارجہ سرایڈورڈ گرے نے اس خطرے کے سدباب کے لئے نہ صرف فرانس بلکہ روس سے بھی سمجھوتہ کر لیا۔ اور مراکو، مصر، ایران، افغانستان، تبت کی نسبت ایسے معاہدے ہوگئے، جن کے بعد برطانیہ ترکی کی مدد سے کنارہ کشی ہوا اور روس کا راستہ صاف ہوگیا چنانچہ روس کی شہ پاکر بلقانی حکومتوں نے ترکی پر حملے کئے اور ایک زمانے میں ترکی کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا۔

ان واقعات نے اسلامی ہندوستان میں بڑا جوش پیدا کردیا ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زمانے میں تو عثمانی ترکوں کی خلافت کبھی تسلیم نہیں ہوئی لیکن برطانوی حکومت کے دوران میں ترکی سے اسلامی ہندوستان کے روابط بڑھ گئے ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں جنگ آزادی کی لہر اٹھی تو برطانیہ کی حکومت کے ایماء پر سلطانِ روم نے ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزوں کی حمایت کا پیغام بھیجا۔ اس کے بعد جب ۱۸۷۷ء میں جنگ روس، روم شروع ہوئی تو ہندوستان میں انگریز

افسروں نے ترکی کے لئے چندے جمع کرنے کی حمایت کی اور ہندوستان میں ایک عام جوش پیدا ہو گیا۔ سلطان عبدالحمید کی تحریک ''اتحادِ اسلامی'' نے ترکی اور ہندوستان کے تعلقات کو اور مضبوط کر دیا۔ اس کے علاوہ ترکی اس زمانے کی سب سے بڑی اسلامی حکومت تھی اور آج کی نسبت اس کی سیاسی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اس کی مشکلات نے اسلامی ہندوستان کو بڑا متاثر کیا۔ مولانا شبلی کو ترکوں سے شروع سے غیر معمولی محبت تھی۔ ترکی کے مصائب دیکھ کر اور عالم اسلام پر آنے والے مصائب کا خیال کر کے ان پر جو اثر ہوا۔ اس کا اظہار انہوں نے نومبر ۱۹۱۲ء میں ایک بڑی پُر درد نظم (شہر آشوبِ اسلام) میں کیا جو اردو زبان کے سیاسی ادب میں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے ؎

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے جب فلک نے کر دیے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

آگے چل کر خیال ظاہر کیا کہ یہ لڑائیاں ملکی یا سیاسی نہیں، مذہبی ہیں (صلیبی جنگ کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ بلادِ مغربیہ سے خطاب ہے۔

کہاں تک ہم سے لو گے انتقامِ فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہم ہیں
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

پھر مسلمانوں سے کہا ہے کہ اگر ترکی مٹ گیا تو اسلام مٹ جائے گا۔

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

شبلی کے مقابلہ میں اقبال چونکہ جوان تھے، اس لئے ان پرسان حالات کا جو گہرا اثر ہوا اس نے ان کے جوشِ جوانی اور حرارتِ ایمانی کے سہارے ان سے کئی نظمیں کہلوائیں

بانگِ درا کے حصہ سوم میں شمع اور شاعر، مسلم۔ نوید صبح فاطمہ بنت عبد اللہ وہ نظمیں ہیں جن کے ساتھ ان کا سال تحریر ۱۹۱۲ء درج ہے، لیکن ان نظموں کے علاوہ بھی بعض انہی سالوں اور انہی حالات کی پیداوار ہیں۔ مثلاً "شفا خانہ" اور "حضور رسالت مآب میں"

اقبال نے "حضور رسالت مآب" جس جلسہ میں پڑھی تھی، اس کا آنکھوں دیکھا حال "نیرنگِ خیال" کے مدیر حکیم محمد یوسف حسن کی زبانی محمد طفیل مدیر نقوش نے نقوش کے افسانہ نمبر (۱۹۶۸ء) میں اس طرح بیان کیا ہے۔

" یہ نظم شاہی مسجد، لاہور میں ہزاروں لاکھوں کے مجمع میں علامہ نے بڑی ہی دلسوز ترنم کے ترنم میں پڑھی، علامہ نے اس دن جس سوز سے نظم پڑھی تھی، وہ سماں بھی دیکھنے اور سننے والا تھا۔

نظم پڑھنے سے پہلے سر شفیع، سر فضل حسین اور مولوی محبوب عالم ایسے اکابرین نے بڑی آتشیں تقریریں کی تھیں جن میں اٹلی کے خلاف مسلمانوں نے اپنے غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا، اس کے بعد علامہ نے نظم سنانی شروع کی۔ مجمع پہ ایک عجیب قسم کا سکوت طاری ہو گیا، فرش پر سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔

علامہ نے جب پوری سرشاری کے ساتھ یہ شعر پڑھا:

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں ۔۔۔ جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

تو لوگوں کا تجسس بڑھا۔ سوال پیدا ہوا۔ بھلا وہ کیا چیز ہوگی، جو جنت میں بھی نہیں ملتی، اس کے بعد جب علامہ نے یہ شعر پڑھا

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں ۔۔۔ طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مجمع بے قابو ہو گیا۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے، نالہ و شیون اور آہ و بکا کا ایسا سماں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جوش اتنا تھا کہ لوگوں

نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے فرش پر تڑپنے لگے۔ آدم کی تڑپ کا وہ عالم ضمیرِ کائنات میں اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا، جو اس چشم فلک نے شاذ ہی دیکھا ہوگا۔"

۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کا واقعہ پیش آیا تو اس سے بھی شبلی اور اقبال بہت متاثر ہوئے شبلی نے اس قسم کے پر درد اور جوشیلے شعر لکھے:۔

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے

شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

ہم قدم آپ کا ہوتا تو بہت ہے دشوار
ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں

پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ
یعنی افسوس ہیں زنجیر کے قابل ہی نہیں

اقبال نے اس واقعہ سے متاثر ہونے کا یہ ثبوت دیا کہ مرزا جلال الدین کے ہمراہ ملزمین کانپور کی طرف سے مقدمہ لڑنے کے لئے کانپور پہنچے۔ اس مقدمہ میں اقبال کے ایما پر مسٹر مظہر الحق بیرسٹر پٹنہ نے جو خدمات سرانجام دیں، ان کی تعریف میں اکبر الہ آبادی کا ایک قطعہ ہفت روزہ "توحید" میرٹھ میں اس طرح شائع ہوا:۔

اکبری سارٹیفکیٹ

مسٹر مظہر الحق کو

حسب فرمائش حضرت اقبال

خادمِ ملت سے مخدوم و مکرم ہوگئے
ان کا درجہ قلق میں باشان رونق ہوگیا

عرش میں پہنچے ہیں مسجد کی طرفداری سے وہ
حق پرستی سے عروجِ مظہر الحق ہوگیا

(اکبر الہ آباد ۷، ستمبر ۱۹۱۳ء)

ہم خیال، ہمسفر اور ہمراز ہونے کی یہی صورتیں ہیں۔ جن کی وجہ سے اقبال شبلی کے انتقال کے بعد اپنے علمی منصوبوں کی تکمیل کے لئے ان کی کمی کو شدت سے محسوس

تفصیل کے لیے رحیم بخش شاہین کی تالیف اوراقِ گم گشتہ دیکھیے۔

کرتے تھے اور سید سلیمان ندوی کو احساس دلاتے رہتے تھے کہ وہ اس کی کمی کو پورا کریں۔ مثلاً ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں:۔

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اس بحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی جو میری نظر سے گزری ہے مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے، مصنف نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے، اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان کو ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا۔"

شبلی کی عظمت کا احساس اور اس سے عقیدت کا اظہار مکتوبات اور دوسری تحریروں کے علاوہ اس نظم میں بہت نمایاں ہے جو شبلی و حالی کے عنوان سے بانگِ درا میں بدیں صورت موجود ہے:

مسلم نے ایک روز یہ اقبال سے کہا
دیوانِ جزو کل میں ہے تیرا وجود فرد

تیرے سرودِ رفتہ کے نغمے علومِ نو
تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد

پتھر ہے اس کے واسطے موجِ نسیم بھی
نازک بہت ہے آئینۂ آبروئے مرد

مردانِ کار ڈھونڈ کے اسبابِ حادثات
کرتے ہیں چارۂ ستمِ چرخ لاجورد

پوچھ ان سے جو چمن کے ہیں دیرینہ رازدار
کیونکر ہوئی خزاں ترے گلشن سے ہم نبرد

مسلم مرے کلام سے بے تاب ہو گیا
غماز ہو گئی غمِ پنہاں کی آہ سرد

کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیتِ خزاں
اوراق ہو گئے شجر زندگی کے زرد

خاموش ہو گئے چمنستاں کے رازدار
سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

"اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد"

صرف پیرو کو ہی پیشرو کی قدر و منزلت اور اہمیت کا احساس نہیں تھا، پیشرو بھی پیرو کی غیر معمولی صلاحیتوں اور اس کے ذوق و شوق سے آشنا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ خود بھی ملی امور کے سلسلہ میں اس سے مشورہ کرنا اور اس کا ہمسفر بننا ضروری سمجھتے تھے۔ وقف اولادکمیٹی کی طرف سے جب وائسرائے کی خدمت میں وفد بھیجنے کی تجویز سامنے آئی تو اقبال کو بھی شبلی نے وفد میں شامل ہونے کے لئے خط لکھا، جس کے جواب میں ۱۲ رجنوری ۱۹۱۳ء کو اقبال نے یہ خط لکھا:۔

"مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولوی صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کا نوازش نامہ ملا۔ انجمن کا جلسہ ایسٹر کی تعطیلوں میں ہو گا۔ اگر وہاں کی شمولیت کے بعد میں لکھنؤ حاضر نہ ہو سکا تو ضرور حاضر خدمت ہوں گا۔

افسوس کہ ڈیپوٹیشن میں شریک ہونے سے قاصر ہوں۔ اگر آپ کا ارشاد ہو تو میں چودھری شہاب الدین بی۔ اے وکیل چیف کورٹ سے دریافت کروں، وہ نہایت قابل آدمی ہیں۔ اور اس کام کے لئے اہل۔ اگر یہ پسند نہ ہو تو نواب ذوالفقار علی خاں، اس وقت کلکتہ میں ہیں، آپ ان کو پنجاب کی طرف سے انتخاب کریں اور ان کو لکھ دیں کہ وہ ۲۹ رجنوری تک کلکتہ میں ہی ٹھہریں۔ مسٹر محمد شفیع بیرسٹر، لاہور بھی اس وقت کلکتہ میں ہیں، غالباً وہ بھی آپ کے لکھنے پر ۲۹ رجنوری تک وہاں قیام کر سکیں گے، جو تجویز پسند خاطر ہو اس کو عمل میں لایئے۔ باقی خیریت ہے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال بیرسٹر، لاہور

اس خط کے دوسرے حصے کا تعلق وقف اولاد کمیٹی سے ہے اور پہلے کا ندوہ کے سالانہ جلسے سے جس میں شرکت کی دعوت کا ذکر مہدی حسن کے نام ۱۶ جنوری کے خط میں اس طرح کرتے ہیں :۔

"جلسہ سالانہ ندوہ اپریل میں ہے۔ اب کے خاص تیاریاں ہیں۔ ڈاکٹر اقبال اور قابل لوگوں کو بلایا ہے۔"

اس خط میں اقبال کو قابل لوگوں کی صف میں شمار کیا ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۱۱ء کے ابوالکلام کے نام خط میں صوبے کے معزز لوگوں کی فہرست میں ان کا نام اس طرح ملتا ہے :۔

"میں نے ہر صوبہ کے معزز لوگوں کے نام پیش کئے۔ کلکتہ سے شمس الہدیٰ مولوی یوسف اور آپ ہیں۔ پنجاب سے شیخ، ڈاکٹر اقبال وغیرہ۔"

کلکتہ میں تو شبلی اور اقبال ۱۹۱۲ء میں یکجا نہ ہو سکے لیکن اس سے چند ماہ پہلے ۱۹۱۱ء میں دہلی میں ملاقات کی ایک خوشگوار صورت پیدا ہو چکی تھی۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس ۱۹۱۱ء میں مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، اس میں اقبال کو ملّت کی طرف سے ترجمانِ حقیقت کا خطاب پیش کیا گیا تھا۔ اس جلسے میں سجاد حیدر یلدرم کی درخواست پر مولانا شبلی نے اقبال کو پھولوں کا ہار پہنایا اور سامعین کے سامنے یہ ارشاد فرمایا :۔

"رسم کوئی معمولی رسم نہیں ہے اور اس کو محض تفریح تصور نہ کرنا چاہئے ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے رہے ہیں، اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے

سجاد یلدرم شبلی اور اقبال، عجب اتفاق ہے کہ تینوں کی ترکی سے لگاؤ عشق کی حد تک تھا۔

ناموں کی نہیں ہوئی محقق طوسی وغیرہ کو اس زمانے کے سلاطین
نے بڑے بڑے خطابات دیئے لیکن آج سوا کتابوں کے اوراق کے
کسی زبان پر نہ چڑھ سکے لیکن قوم کی طرف سے محقق کا جو خطاب دیا
گیا تھا۔ وہ آج تک زبان زدِ خاص وعام ہے۔ جو عزت قوم کی طرف
سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے، وہ ان کے لئے بڑی عزت اور فخر
کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کا
علم، ادب اور ان کی شاعری کا مقابلہ غالب کی شاعری سے کیا جائے
تو مبالغہ نہیں ہو سکتا۔"

میرے خیال میں اس بیان میں محقق طوسی اور غالب کے متعلق، دونوں حوالے
قابلِ توجہ ہیں۔ محقق طوسی کے حوالے سے فنِ تحقیق سے ایک طرف تو شبلی کے اپنے لگاؤ
کی غمازی ہوتی ہے۔ دوسری طرف اقبال کے تحقیقی اندازِ فکر اور ان کے محبوب
موضوعات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شبلی جیسے فن شناس اور باکمال
محسن سے محقق طوسی کی تعریف سن کر اقبال نے تحقیق و تخلیق کی اس راہ پر گامزن رہنا
یقیناً مناسب سمجھا ہوگا، جس پر وہ پہلے سے اپنا سفر شروع کر چکے تھے۔

غالب کے متعلق حوالے سے اقبال کی شاعرانہ عظمت اور ادبی اہمیت کے پہلو
ہمارے سامنے آتے ہیں۔ شبلی نے یہ رائے اس وقت ظاہر کی تھی، جب ابھی اقبال کا کوئی
شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں "اقبال کو غالب کے مقابلے میں لانا"...
میں سمجھتا ہوں ایک غلط بات تھی۔ غالب پر ظلم تھا۔ مختلف علمی اور ادبی رسائل میں
اقبال کی چند غزلیں پڑھ کر یا کسی صورت میں سن کر اس قسم کی رائے کا اظہار نامناسب
تھا۔ اور پھر جبکہ سنہ ۱۹۱۱ء تک کی غزلوں میں غالب سے زیادہ داغ کا اثر نمایاں ہے
حقیقت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۱۱ء تک اقبال کی نظمیں زیادہ شائع ہوئی تھیں اور نظموں کی وجہ

سے انہیں مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ دریں صورت نظم گو اقبال کو غزل گو غالب کے سامنے کھڑا کرتا میرے خیال میں بالکل غلط فیصلہ تھا معلوم ہوتا ہے کہ شبلی نے اس رائے کا اظہار تحقیق وتنقید کے اصولوں کے پیشِ نظر نہیں ہو گا۔ بلکہ اس جذبے سے مغلوب ہو کر کیا ہو گا جس جذبے کی بنا پر زمانہ طالبعلمی میں ان کے استاد مولانا فاروق چڑیا کوٹی۔ اپنے آپ کو صرف دانش کا شیر اور شبلی کو بچہ شیر کہا کرتے تھے۔ اسی جذبے سے سرشار شبلی سید سلیمان ندوی، ابو الکلام آزاد اور عبد السلام ندوی میں بھی خود اعتمادی پیدا کرنے اور ان کو احساسِ برتری دلاتے نظر آتے ہیں۔ اقبال گو شبلی کے شاگرد نہیں تھے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلق اس انداز کا پیدا ہو چکا تھا۔ عزیز دوست آرنلڈ کا شاگرد شبلی کو اپنے شاگردوں کے برابر عزیز تھا پھر جس جلسے میں شبلی نے یہ رائے ظاہر کی تھی، اس کی نوعیت بھی ... تھی کہ شبلی اقبال کو اچھے ہیرو کی حیثیت سے پیش کرنے اور مبالغے کی حد تک اس کی مدح میں رطب اللسان ہوتے ہوئے اس بلند مقام پہ پیش کرتے، جس پر اسے دیکھنا چاہتے تھے۔

اس حوالے سے یہ خیال بھی میرے سامنے آیا کہ شبلی نے غالب اور اقبال کی جو بات کہی تھی، ممکن ہے کہ وہی بانگِ درا کے دیباچہ میں سر عبد القادر کی اس رائے کا محرک بنی ہو، جس سے اس مضمون کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ شبلی اور اقبال کی اپنی نگارشات اور ان کے بارے میں دوسروں کی تحریریں سنہ ۱۹۱۱ء کے قریب کے زمانے میں اکثر و بیشتر "مخزن" میں چھپتی تھیں۔ ممکن ہے کہ محولہ بالا جلسے کی روداد مخزن میں یا کسی دوسرے پرچے میں شائع ہوئی ہو اور شیخ عبد القادر نے اسے پڑھا ہو اور پھر بانگِ درا کا دیباچہ لکھتے وقت شبلی کی بات کو اپنے انداز میں پیش کر دیا ہو۔ اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اقبالیات کے سلسلہ میں جو کتب اور رسائل اب تک منظرِ عام پہ آئے ہیں، ان

ان میں ۱۹۱۱ء سے پہلے کسی کی کوئی ایسی رائے نہیں ملتی۔ جس میں اقبال اور غالب کا موازنہ یا مقابلہ کیا گیا ہو۔

بہر صورت دونوں حوالے شبلی کی تقریر میں ایسے ہیں کہ جو یقیناً اقبال جیسے ذہین اور حساس انسان کی راہوار فکر کے لئے تازیانہ ثابت ہوئے ہوں گے اور انہوں نے اپنے آپ کو اس عظمت کا مستحق بنانے کا فیصلہ کر لیا ہو گا جو محقق طوسی اور غالب کو حاصل تھی اور جو بحر در ایام شبلی کی راہ پر چلتے ہوئے اقبال کو بھی حاصل ہو گئی۔

علامہ اقبال محقق اور نقاد کی حیثیت سے

قارئین یا سامعین علامہ اقبال کو بالعموم شاعر کی حیثیت سے جانتے اور پہچانتے ہیں، جب ان کا کلام پڑھتے یا سنتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ محبت احترام اور عقیدت کے جذبات اپنے اندر محسوس کرتے ہیں لیکن یہ سب کی بات نہیں ہے، اکثریت کی ضرور ہے۔ اقلیت کے بیں کچھ لوگ ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے یا ان کے کلام پہ نکتہ چینی کرنے والے کل بھی موجود تھے اور آج بھی ہیں، لیکن اس بات کو تسلیم کرنے سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ وہ ماضی میں سب کے لئے قابلِ توجہ تھے، حال میں بھی ہیں اور مستقبل میں بھی رہیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے اور بہت کچھ بھی تھے۔ فارسی کا مشہور صاحب طرز شاعر نظیری کہتا ہے ہ

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست!

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

میری نظر میں حکیم الامت بھی نظیری کے بت سے مختلف نہیں ہیں، ان کی بھی کئی ادائیں ہیں۔ اور ہر ادا کے متعلق حسن شناس یہ محسوس کرتا ہے کہ

ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

حق شناسی، قدر دانی اور مکمل آگہی کے اصولوں اور مقاصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر اقبالیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو سیالکوٹ کا اقبال، عالمِ اسلام کا اقبال

بلکہ عالم انسانیت کا اقبال نیٹنے تک کئی مختلف حیثیتوں سے ہمارے سامنے آتا ہے محقق نقاد، شاعر، متکلم، قانون دان، ماہر تعلیم سیاست دان، قومی راہنما، داعی اسلام، عاشق رسول، کئی حیثیتیں ان کی ذات میں جمع نظر آتی ہیں۔ اس لحاظ سے عربی کے مشہور شاعر ابو نواس کا یہ شعر ان پر بالکل صادق نظر آتا ہے ؎

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

یعنی خدا کے لئے یہ امر محال نہیں ہے کہ وہ ایک شخص کی ذات میں تمام عالم کو جمع کر دے۔ اس طرح سے جب ایک شخص اپنی ذات کے اعتبار سے ایک عالم کے برابر ہو تو پھر کسی بھی شخص کا اس کے متعلق کامل آگہی کا دعویٰ حقیقت پر مبنی نہیں ہو گا یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی جامع الحیثیات شخصیتوں کے متعلق تصنیف و تالیف کے سلسلے میں بہت بڑے بڑے ذخیرے جمع ہونے کے باوجود تشنگی کا احساس برقرار رہتا ہے اور اس پیاس کو بجھانے کے لئے ہم اپنے محدود علم اور مخصوص صلاحیتوں کے سہارے ایسی عظیم شخصیتوں کو نت نئے روپ اور نئے رنگ میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے افکار کے محرکات، مضمرات اور ثمرات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی حکیم الامت کو محقق اور نقاد کی حیثیت سے پیش کرنا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ایسا پہلو ہے جس کی طرف کماحقہٗ توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ وہی بین الاقوامی فکری سازش یا مصلحت اندیشی ہے۔ جو عمر خیام کو ماہر ریاضی کی صورت میں نمایاں کرنے کی بجائے فلسفۂ عیش کوشی کے ترجمان شاعر کی حیثیت سے منظر عام پر لانے کا باعث بنی تھی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عمر خیام کی شاعری کو تو بہت نمایاں کیا گیا اور اس کے نام پر ہوٹل اور کلب بھی قائم کئے گئے لیکن علم ریاضی کے لئے اس کی خدمات کو ثانوی حیثیت دی گئی اور کسی علمی ادارے میں اس کی کوئی یادگار قائم نہ کی گئی۔ یہ سلوک مغرب کے سیاسی شاطروں

کی بدولت صرف عمر خیام کے بارے میں روا نہیں رکھا گیا بلکہ تمام مسلماں سائنس دانوں کے ساتھ بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔ حکیم الامت خود اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۲۸ء میں شجاع ناموس نے ایم۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کر لیا تو انہیں یہ تحریر فرمایا:-

"یورپ تو تجاویز بنا کر صرف کثیر سے اسلام کی عظمت کو پسِ پشت ڈال رہا ہے، اور اپنے علماء کے کارناموں کا ڈھنڈورہ پیٹتا رہتا ہے، اگرچہ عہدِ متوسط کے یورپ کے تمام علوم و فنون کے ماخذ اسلامی علوم ہیں اور اکثر اوقات تو وہ عربی کتابوں کے تراجم ہیں۔ جو یورپ کے عالموں نے اپنے نام سے نشر کر دیئے تم اس تحقیق کی تکمیل کر دا ور میں سمجھتا ہوں تم نے انگریزی زبان، فزکس، کیمسٹری، باٹونی، زوولوجی، رہا گئی تو سبقاً سبقاً کالج میں پڑھ لی مگر جب تک تم فارسی عربی پر کامل عبور حاصل نہیں کرو گے، تم اس اہم اسلامی فریضہ کو ادا نہیں کر سکو گے۔"

ملت کے ایک دردمند کے مخلصانہ مشورے کا یہ خوشگوار اثر ہوا کہ شجاع ناموس تحقیق کے میدان میں قدم رکھ کر ڈاکٹر شجاع ناموس بن گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے صرف عربی اور فارسی پر ہی عبور حاصل نہ کیا بلکہ اردو اور پشتو میں بھی مہارت حاصل کی اور ان زبانوں کے اعلےٰ امتحانات میں کامیابی حاصل کی راہنمائی اور حوصلہ افزائی کی یہ صورت اپنے ملک تک ہی محدود نہیں تھی۔ دوسرے ممالک میں تحقیقی منصوبوں میں مصروف محققین کو بھی حکیم الامت اپنے علمی مشوروں سے سرفراز فرماتے تھے۔ اس سلسلہ میں اٹلی میں مقیم ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے نام ان کے ۱۳/ جون ۱۹۳۳ء کو تحریر کردہ مکتوب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس

مکتوب میں فرماتے ہیں :۔

"اٹیلین زبان میں جن مضامین کا آپ نے ذکر کیا ہے، افسوس ہے،
مجھے ان کا علم نہیں، اگر ممکن ہو تو ان کا انگریزی میں ترجمہ کرا کر بھیج
دیجئے، ترجمہ اور ٹائپ کا خرچ میں ادا کر دوں گا۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ
دونوں رسالے جن میں یہ مضامین شائع ہوئے ہیں بھیج دیجئے، میں
ان کا یہاں ترجمہ کروانے کی کوشش کروں گا۔ اور جب آپ یورپ
سے واپس آئیں گے تو دونوں رسالے آپ کے حوالے کر دوں گا
ڈیکارٹ پر مضمون لکھنے کی اب مجھ میں ہمت باقی نہیں رہی۔ اگر
آپ کو پیرس میں نوجوان عمر کا سکالر مل جائے تو اس سے یہ کہنا
ڈیکارٹ کی مشہور کتاب method کا امام غزالی کی احیاء العلوم
سے مقابلہ کریں اور یورپ والوں کو دکھایئے کہ ڈیکارٹ اپنے
اس method کے لئے جس نے یورپ میں نئے علوم کی بنیاد رکھی،
کہاں تک مسلمانوں کا ممنونِ احسان ہے مغربی فلسفہ کا مؤرخ Lewes
تو یہ لکھتا ہے کہ اگر ڈیکارٹ عربی زبان کا عالم ہوتا تو ہم اسے غزالی
کی احیاء العلوم سے چوری کرنے کا الزام لگاتے لیکن اٹلی کا مشہور شاعر
ڈانٹے بھی تو شاید عربی نہ جانتا تھا لیکن اس کی کتاب۔ comedy
Dante شاید محی الدین عربی کے افکار و تخیلات سے لبریز ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے نتائج افکار عام طور پر یورپ میں
مشہور تھے اور یورپ کے بڑے بڑے مفکر اور تعلیم یافتہ آدمی
خواہ وہ عربی جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، عام طور پر اسلامی
تخیلات سے آشنا تھے۔ انگریزی کتابوں میں ہم ہندی مسلمانوں

کو یہ سکھایا ہے کہ منطق استقرائی کا موجد بیکن (BACON) تھا لیکن فلسفۂ اسلامی کی تاریخ بتاتی ہے کہ یورپ میں اس سے بڑا جھوٹ آج تک نہیں بولا گیا۔ ارسطو کی منطق کی شکل اوّل پر سب سے پہلے اعتراض کرنے والا ایک مسلمان منطقی تھا یہی اعتراض JOHN STUART MILL کی کتابوں میں دہرایا گیا ہے اور مسلمانوں کا استقرائی طریق بیکن سے مدتوں پہلے سارے یورپ کو معلوم تھا۔

محمود خضیری سے میں سپین میں ملا تھا۔ وہ اس وقت فقہ اسلامیہ پر ریسرچ کر رہے تھے۔ نہایت نیک نوجوان ہیں مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ نصیر الدین طوسی پر مقالہ پڑھیں گے۔ ان سے کہئے کہ نصیر الدین طوسی کی تحریروں کا وہ حصہ جس میں طوسی نے EUCLID کے POSTULATE PARALLIL کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، بالخصوص مطالعہ کریں بلکہ اس ضمن میں ان کے معاصرین کی تحریروں کا مطالعہ بھی کریں۔ اس تحقیق سے ان کو معلوم ہو گا کہ مسلمان ریاضی دان قرونِ وسطیٰ میں ہی اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ مکان کے ابعاد تین سے زیادہ ہوں اور ہمارے اسلامی صوفیہ تو ایک مدت سے تعددِ زماں و مکان کے قائل ہیں۔ یہ خیال یورپ میں سب سے پہلے جرمنی کے فلسفی KANT نے پیدا کیا تھا لیکن مسلمان صوفیہ اس سے پانچ چھ سو سال پہلے اس نکتہ سے آشنا تھے۔ عراقی کے رسالے کا قلمی نسخہ غالباً ہندوستان میں موجود ہے اور میں نے ان کے ایک سالہ کا جو خاص طور پر زمان اور مکان پر ہے۔ اپنے لیکچروں میں ملخص بھی دیا ہے۔ اگر محمود خضیری بھی اس مضمون پر ریسرچ کریں تو مجھ کو یقین ہے کہ یورپ میں نام پیدا کریں گے۔

اس خط سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکیم الامت اپنی اور دوسروں کی معلومات میں اضافہ کے لئے دامے، درمے، قدمے، سخنے غرضیکہ ہر طرح سے قربانی دینے والے انسان تھے۔ وہ مغرب سے مرعوب نہیں تھے مسلمانوں کے علمی سرمائے سے وہ بخوبی واقف تھے اور اس سرمایہ پر انہیں فخر تھا۔ اس سرمایہ کی نشاندہی کرنے والوں اور اس سرمایہ میں اضافہ کرنے والوں کی سرگرمیوں کی اطلاع ان کے لئے خوشی کا باعث بنتی تھی۔ ان کا اپنا مطالعہ کسی ایک زبان کی تصنیف تک محدود نہیں تھا، انگریزی، عربی، فارسی، اردو، جرمن، اطالین، فرانسیسی غرضیکہ دنیا کی مختلف زبانوں سے استفادہ وہ ضروری سمجھتے تھے۔ ان پہلوؤں کی ترجمانی صرف اس ایک خط سے نہیں ہوتی، متعدد خطوط سے ہوتی ہے۔ جو حکیم الامت کے مکتوب کے مختلف مجموعوں میں ملتے ہیں کیا اس نوعیت کے خطوط لکھنے والے مکتوب نگار کو بارِ ریسرچ میں اس انداز سے غیر معمولی دلچسپی لینے والے قلمکار کو صرف شاعر کی حیثیت سے شہرت بخشنا انصاف اور ملکی و ملی مفاد کے تقاضوں کے مطابق ہے ؟

میں سمجھتا ہوں کہ نہیں

کیونکہ حکیم الامت نے انگریزی اور اردو میں جو وسیع اور رنگارنگ نثری سرمایہ اپنی یادگار چھوڑا ہے، وہ ضخامت، اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے شعری سرمایہ سے اگر بہتر نہیں تو ہم پلہ ضرور ہے۔ میرے خیال میں ہمیں حکیم الامت کو محقق اور نقاد کی حیثیت سے پہلے دیکھنا چاہئے اور شاعر یا نثر نگار کی صورت میں بعد میں کیونکہ شاعری اور نثر تو دو ایسے متوازی راستے ہیں جن پر چلتے ہوئے وہ اپنی تحقیق کے نتائج دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں یہی منزل نہیں۔ ایک راستہ ہے، ان کی نظر راستے پر نہیں منزل پر تھی

اس اندازِ فکر اور طرزِ عمل کا مظہر خاص طور پر وہ خط ہے جو حکیم الامت نے سید محمد سعید الدین جعفری کے نام لکھا تھا۔ مکتوب الیہ جالندھر کے رہنے والے تھے اور غالباً جج کے فرائض انجام دیتے ہوئے ان کی زندگی بیشتر حصہ یو۔پی میں بسر ہوا۔ یہ خط "انوارِ اقبال" اور "اوراقِ گم گشتہ" میں شامل ہے۔ اس خط میں حکیم الامت فرماتے ہیں:۔

"ایشیا کے قدیم مذاہب کی طرح اسلام بھی زمانہ حال کی روشنی میں مطالعہ کئے جانے کا محتاج ہے، پرانے مفسرین قرآن اور دیگر اسلامی مصنفین نے بڑی خدمت کی ہے مگر ان کی تصانیف میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو جدید دماغ کو اپیل نہ کریں گی۔ میری رائے میں بحیثیت مجموعی زمانہ حال کے مسلمانوں کا امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ان کی کتب زیادہ تر عربی میں ہیں مگر شاہ صاحب موصوف کی حجۃ اللہ البالغہ کا اُردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، حکماء میں ابن رشد اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ دیکھا جائے اس کی ہذا القیاس غزالی اور رومی علیہ الرحمتہ۔ مفسرین میں معتزلی نقطہ خیال سے زمخشری، اشعری نقطۂ خیال سے رازی اور زبان و محاورہ کے اعتبار سے بیضادی۔ نئے تعلیم یافتہ مسلمان اگر عربی زبان میں اچھی دستگاہ پیدا کر لیں تو اسلام (RE-INTERPRETATION) میں بڑی مدد دے سکیں گے۔ میں نے اپنی تصانیف میں ایک حد تک یہی کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ انشاء اللہ اس پر نثر میں بھی لکھوں گا۔

(۲) الفاظ کے انتخاب میں لکھنے والا (شاعر) اپنی حس موسیقیت سے کام لیتا ہے اور مضامین کے انتخاب میں اپنے فطری جذبات کی پیروی پر مجبور ہوتا ہے۔ اس امر میں کسی دوسرے شخص کے مشورے پر خواہ وہ کیسا ہی نیک مشورہ کیوں نہ ہو عمل نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرے اعتراض کے متعلق یہ بھی عرض ہے کہ میرے نزدیک اسلام نوعِ انسان کی اقوام کو جغرافی حدود سے بالاتر کرنے اور نسل و قومیت کے مصنوعی مگر ارتقائی انسانی کے ابتدائی مراحل میں مفید امتیازات کو مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے۔ اس وجہ سے اور مذاہب (یعنی مسیحیت، بدھ ازم وغیرہ) سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ چونکہ اس وقت ملکی اور نسلی قومیت کی لہر یورپ سے ایشیا میں آ رہی ہے اور میرے نزدیک انسان کے لئے یہ ایک بڑی لعنت ہے، اس واسطے بنی نوع انسان کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وقت اسلام کے اصلی حقائق اور اس کے حقیقی بنیاد پر زور دینا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں خالص اسلامی نقطۂ خیال کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتا ہوں۔ ابتدا میں میں بھی قومیت پر اعتقاد رکھتا تھا اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے پہلے میں نے دیکھا تھا لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے خیال میں تبدیلی کر دی اور اب قومیت میرے نزدیک محض ایک عارضی نظام ہے، جس کو ہم ایک ناگزیر رشتہ سمجھ کر گوارا کر سکتے ہیں۔ آپ (PAN ISLAM) کو ایک پولیٹیکل یا قومی تحریک تصور کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک

طریق غیر اقوام انسان کو جمع کرنے اور ان کو ایک مرکز پر لانے کا ہے۔ اس غرض سے ایک مرکز شہودی پہ مجتمع ہو جائے اور ایک ہی قسم کے خیالات رکھنے اور سوچنے کے باعث یہ اقوام نسلی اور قومی اور ملکی امتیازات و تعصبات کی نسبت سے آزاد ہو جائیں پس اسلام ایک قدم ہے، نوع انسان کے اتحاد کی طرف یہ ایک سوشل نظام ہے جو حریت اور مساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے۔ پس جو کچھ میں اسلام کے متعلق لکھتا ہوں، اس سے میری غرض محض خدمت بنی نوع ہے اور کچھ نہیں، اور میرے نزدیک عملی نقطۂ خیال سے صرف اسلام ہی (HUMANITARIAN IDEAL) کو (ACHIWE) کرنے کا ایک کارگر ذریعہ ہے۔ باقی ذرائع محض فلسفہ ہیں۔ خوشنما ضرور ہیں مگر ناقابلِ عمل مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خالص اسلامی حقائق پر لکھنے اور ان کو نمایاں کرنے سے ہندوستان کی اقوام میں باہمی عناد بڑھتا۔ اس بات میں میں آپ سے متفق ہوں کہ مسلمانوں کو محبت کا طریق اختیار کرنا چاہئے۔ نبی کریم کی حدیث ہے کہ مسلمان دنیا کے لئے سراپا شفقت ہے۔ مگر اس اخلاقی انقلاب کو حاصل کرنے کے لئے یہی ضروری ہے کہ اسلام اپنی اصلی روشنی میں پیش کیا جائے۔ میرا ذاتی طریق یہی ہے کہ میں دنیا کی تمام مذہبی تحریکوں کو ادب اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں گو یہ احترام مجھے ایسی تنقید سے باز نہیں رکھ سکتا جس کی بنا دیانت پر ہو، اور جس میں سوائے خلوص کے اور کچھ نہ ہو۔ غرضیکہ میرا عقیدہ یہ ہے

اور یہ عقیدہ محض خاندانی تربیت اور اس ماحول کے اثرات کا نتیجہ نہیں بلکہ بیس سال کے نہایت آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ اس وقت اقوامِ انسان کے لئے سب سے بڑی نعمت اسلام ہے جو شخص مسلمان کہلاتا ہے، اس کا فرض ہے کہ قومی تعصب کی وجہ سے نہیں بلکہ خالصتہً لِلّٰہ اپنی زندگی میں ایک عملی انقلاب پیدا کرے اور اگر دماغی قوت رکھتا ہے تو اپنی بساط کے مطابق اسلام کے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرے تاکہ نوعِ انسانی قدیم توہمات سے نجات پائے، مسلمانوں کو تو سیاسیات سے پہلے اشاعتِ اسلام کا کام ضروری ہے۔ تاہم دونوں کام ساتھ ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔

منظر علی صاحب کے مذہبی عقاید کا حال سن کر مجھے کچھ تعجب نہیں ہوا کیونکہ (NATIONALISM) نے قریباً ہر ملک میں مذہب کو (DISPLACE) کیا ہے لیکن الحمد للہ ان کے خیالات نے اس طرف پلٹا کھایا اور ان کو تحقیق کا شوق پیدا ہوا۔ چند مصنفیں کے نام میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ میری رائے میں سید سلیمان ندوی اور مولانا ابو الکلام اس بارے میں بہتر مشورہ دے سکیں گے۔"

یہ خط حکیم الامت نے ۴ ار نومبر ۱۹۲۲ء کو تحریر فرمایا تھا۔ اس میں انہوں نے یہ اعلان فرمایا ہے۔ کہ ان کا یہ عقیدہ کہ "اس وقت اقوامِ انسان کے لئے سب سے بڑی نعمت اسلام ہے۔" ان کے "بیس سال کے نہایت آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے۔" اس بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انہوں نے غور و فکر کا سلسلہ ۱۹۰۲ء میں شروع کیا تھا۔ تقریباً یہی صورت گرامی کے نام یکم جولائی ۱۹۱۷ء والے

خط سے اس طرح ہمارے سامنے آتی ہے!۔

" مثنوی کا دوسرا حصہ قریب الاختتام ہے مگر اب تیسرا حصہ ذہن میں آرہا ہے اور مضامین دریا کی طرح امڈے آرہے ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کو نوٹ کر دوں، اس حصے کا مضمون ہو گا حیاتِ مستقبلہ اسلامیہ۔

یعنی قرآن شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جماعتِ اسلامیہ جس کی تاسیس دعوتِ ابراہیمی سے شروع ہوئی کیا کیا واقعات و حوادث آئندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے۔ میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآن شریف میں موجود ہیں۔ اور استدلال ایسا صاف و واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے۔ میں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا اور بعض آیات و سورتوں پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا ہے اور اتنے طویل عرصے کے بعد مندرجہ بالا نتیجے پر پہنچا ہوں مگر مضمون بڑا نازک ہے اور اس کا لکھنا آسان نہیں۔"

اس خط سے بھی غور و فکر کے آغاز کا سال تقریباً ۱۹۰۳ء ہی قرار پاتا ہے ۱۹۰۳ء سے ۱۹۲۳ء تک کی مسافت اور اس کے بعد کی مسافت ان کے راہوارِ فکر نے کس طرح طے کی! اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ تحقیق سے مراد صرف علمی اور ادبی تحقیق نہیں تحقیق کا وسیع مفہوم پیشِ نظر ہے۔ حقیقت کی تلاش کسی بھی معاملے میں بات کی تہہ تک پہنچنے کی

کوشش۔ انسانی مسائل کو سمجھنے اور ان کے حل کے لئے تگ و دو۔ دوسرے لفظوں میں غالب کے اس مصرعے ؎

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

کو سمجھنے کی کوشش سے لے کر اعمی توانائی کے جملہ تجربات تک، سبھی کوششیں تحقیق کے دائرے میں شامل ہیں۔ یہی صورت تنقید کی ہے۔ تنقید کا مطلب صرف زبان اور ادب کو سمجھنا، جانچنا اور پرکھنا ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے کو اس نقطہ نظر سے دیکھنا ہے۔ فنونِ لطیفہ، مذہب، تاریخ، سیاست غرضیکہ ہر موضوع یا شعبہ حیات پر تنقید ہو سکتی ہے۔ پھر تحقیق اور تنقید میرے خیال میں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ تنقیدی شعور کے بغیر تحقیق ممکن نہیں اور تحقیق کے اصولوں سے آشنائی کے بغیر تنقید نہیں ہو سکتی۔ کامیاب محقق وہی ہو گا جو تنقیدی شعور کا مالک ہو گا۔ اور کامیاب نقاد وہی ہو گا جو فنِ تحقیق سے آشنا ہو گا۔

میرے خیال میں اقبال فنِ تحقیق سے بھی واقف تھے اور تنقیدی اصولوں سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ فنِ تحقیق سے آشنا ہونے اور اس فن کا تجربہ حاصل کرنے کے مواقع ان کو میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے ملے اور تنقیدی اصولوں سے واقفیت انہیں اپنے وسیع مطالعہ کی بدولت حاصل ہوئی۔ ان کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مشہور شاعر اور نقاد MATHOW AREVL کے تنقیدی نظریات سے وہ باخبر تھے۔ سات اپریل ۱۹۱۷ء کو شائع ہونے والے مشہور انگریزی جریدے NEW EAR میں لکھتے ہیں:۔

"MATHEW ARNOLD DEFINES POETRY AS CRITICIRM OF LIFE - THE LIFE IS CRITICISM OF POETRY IS EQUALLY TRUE -

"

یورپ میں قیام کے دوران مشہور محقق اور نقاد پروفیسر براؤن سے ملاقاتیں بھی یقیناً اس سلسلہ میں بہت مفید ثابت ہوئی ہوں گی۔ تحقیق اور تنقید کی یہی معنوی وسعت ہے، جس نے مجھے یہ حوصلہ بخشا کہ حکیم الامت کو آپ کے سامنے محقق اور نقاد کی صورت میں پیش کروں اور ان کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کا جائزہ لوں۔

تحقیق اور تنقید ایسی کٹھن اور پُر پیچ راہیں ہیں کہ ان پر سلامتی اور کامیابی سے چلنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ یہ صبر آزما اور ہمت طلب کام ہے۔ مولانا حالی نے "حیاتِ جاوید" کے دیباچہ میں سوانح نگاری کو کان کنی قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں محقق اور نقاد کا فن بھی کان کن کے فن سے مختلف نہیں ہے جس طرح کان کن کان کا سینہ چیر کر خاص لگن، مستقل مزاجی اور حسن شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معمولی پتھروں اور قیمتی پتھروں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے، اسی طرح محقق اور نقاد بھی اپنی معلومات اور تجربات کے وسیع ذخیرے سے ضروری اور غیر ضروری مواد کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہوئے اپنے گوہر مقصود تک پہنچتے ہیں۔ گوہر مقصود مل جانے کے بعد سفر ختم نہیں ہوتا، بلکہ ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سفر میں کان کن، محقق یا نقاد اپنی دریافت، اپنے نتیجہ یا فیصلہ سے دوسروں کو آگاہ کرتا ہے اور شعوری یا غیر شعوری صورت میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کی داد کا طالب ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حسب توقع جواب ملے اور ہو سکتا ہے کہ خلاف توقع فیصلہ ہو کیونکہ اختلاف بھی تو ایک ازلی اور ابدی حقیقت ہے۔ اسی حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے میں یہ کہتا ہوں کہ تحقیق اور تنقید کی راہوں پر چلنا اور اختلاف سے بچنا ایک امر محال ہے، اپنی پگڑی سنبھالنا اور دوسروں کی پگڑی اتارنا تو آسان ہے لیکن اپنے سر سے پگڑی اتار کر دوسروں کو سر پر باندھنا بہت ہی مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ جب غالب تنقید اور تحقیق کی راہوں پر چلے تو انہیں

طیش میں خوفِ خدا نہ رہا اور عیش میں یادِ خدا نہ رہی انھوں نے "غیاث اللغات" کو "حیضِ کالتہ" قرار دیا اور قتیل کو "اُلو کا پٹھا" کہہ کر اپنی آتشِ انتقام کو بجھایا یا مزید بھڑکایا۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر پروفیسر سید وقار عظیم نے جب اپنے ایک مضمون میں غالب کے تنقیدی مزاج کو پہچاننے کی کوشش کی تو یہ کہنا مناسب سمجھا کہ:۔

"غالب کی مجروح اور زخم خوردہ انانیت نے اُردو نثر میں ایک ایسی تنقید کی طرح ڈالی جس کا مزاج سفراوی اور سوداوی ہے جو دشنام طرازی کو بھی جائز سمجھا ہے"

گو سر عبدالقادر کے خیال میں

"غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور اقبال کی بدولت غالب کلبے نظیر تخیلی اور نرالا اندازِ بیان پھر وجود میں آیا جس نے اُردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی۔"

لیکن میرے خیال میں تحقیق اور تنقید کی راہیں، وہ راہیں جن پر جدت پسند اقبال کلی طور پر غالب سے آزاد ہو کر چلے ہیں۔ اقبال کا تنقیدی مزاج یقیناً سفراوی اور سوداوی نہیں ہے، وہ علمی مسائل میں دوسروں کو اختلاف کا حق دیتے ہیں اور خود اختلاف کی صورت میں تحمل، بردباری، فراخدلی اور قوتِ برداشت سے کام لیتے ہیں۔ تنقید کو وہ بدنیتی، ذاتی حملوں، تلخ اور دل آزار عناصر سے پاک رکھنا ضروری سمجھتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ تنقید ہمدرد صاحب نے بالخصوص حضرت ناظر صاحب کی نسبت اور بعض جگہ میری نسبت دل آزار الفاظ استعمال کیے ہیں مگر میں باوجود حق اور قدرت کے اس بات سے احتراز کروں گا کیونکہ فنِ تنقید کا پہلا اصول یہی ہے کہ اس کا ہر لفظ

نفسیات کے جوش سے مرا ہو، تنقید کی بنا دوستی، محبت اور نیک نیتی پر ہونی چاہئے نہ یہ کہ مضمون تو اپنے خیال میں از راہِ دوستی لکھیں اور طرزِ بیان ایسا اختیار کریں کہ دوستی اور دشمنی میں تمیز نہ ہو سکے۔[1]

اقبال اپنی تحریروں میں بہت فراخدلی اور دور اندیشی سے کام لیتے نظر آتے ہیں، کسی ایک شخص کے فن پر معاندانہ تنقید کی مثالیں ان کی تحریروں میں بہت کم ملتی ہیں، اردو، فارسی، اور انگریزی کے بعض شاعروں، مفکروں اور ادیبوں کے متعلق ان کی جو نظمیں یا اشعار ہیں۔ ان میں بعض تنقیدی آرا یقیناً قابلِ قدر ہیں۔ مثلاً داغ کے متعلق چند اشعار دیکھئے جن میں ان کے اندازِ بیان کی خصوصیات بہت عمدہ صورت میں حقائق کے مطابق بیان کی گئی ہیں؛

اب کہاں وہ بانکپن، وہ شوخیِ طرزِ بیاں — آگ تھی کافورِ پیری میں جوانی کی نہاں
تھی زبانِ داغ پر، جو آرزو ہر دل میں ہے — لیلیٰ معنی وہاں بے پردہ، یاں محمل میں ہے
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز — کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں — اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں
تلخیِ دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے — یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے
اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی — سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی
اٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بت خانے سے — مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے

---

[1] مضمون بعنوان "اردو زبان پنجاب میں" مطبوعہ مخزن بابت اکتوبر ۱۹۰۲ء

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی! تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

اصل میں یہ اشعار جس نظم میں شامل ہیں، وہ اقبال نے اپنے استاد داغ کے مرثیہ کی صورت میں کہی تھی۔ دونوں کے تعلق اور نظم کی غرض و غایت کو اگر مدِ نظر رکھا جائے تو اس نظم میں اس بات کا امکان تھا کہ اقبال اپنے استاد کے عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی قرار دیتے لیکن اقبال نے یہ نہیں کیا۔ داغ جیسے تھے ویسے ہی اس نظم میں ملتے ہیں۔ اقبال نے تحقیق اور تنقید کے اصولوں کے مطابق اپنی رائے پیش کی ہے۔

فارسی کے مشہور شاعر عرفی کے متعلق جو نظم بانگِ درا میں شامل ہے، مختصر ہونے کے باوجود عرفی کو حقیقی رنگ میں پیش کرتی ہے۔ مثلاً اس کے تخیّل کی بلندی کو نظم کے آغاز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

محل ایسا کیا تعمیر عرفی نے تخیّل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی
فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی
میسّر جس سے ہیں آنکھوں کو اب تک اشکِ عنابی

انگریزی کے مقبول ڈرامہ نگار شیکسپیئر پر جو نظم ہے اس کی بھی یہی صورت ہے گنتی کے چند اشعار میں اس کی نمایاں خصوصیات بیان کر دی گئی ہیں مثلاً یہ اشعار دیکھئے:۔

تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا
تابِ خورشید میں خورشید کو پنہاں دیکھا
چشمِ عالم سے تو ہستی رہی مستور تری
اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

غالب گو اقبال کے محبوب شعراء میں سے ایک ہیں، ان کے متعلق ایک نظم لکھ کر اقبال نے ان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے، لیکن ان کی چند خامیوں کا انہیں جب بھی احساس ہوا انہوں نے ان کو بیان کر دیا۔ مثلاً "غالب نامہ" کے مصنف شیخ محمد اکرام ۱۲ مئی ۱۹۳۷ء کو لکھتے ہیں :۔

"آپ نے غالب پر ایک نہایت عمدہ تصنیف پیش کی ہے۔ اگرچہ مجھے لبکہ چند نتائج سے اتفاق نہیں۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ حضرت غالب کو اردو نظم میں بیدل کی تقلید میں ناکامی ہوئی۔ غالب نے بیدل کے الفاظ کی نقالی ضرور کی لیکن بیدل کے معانی سے اس کا دامن تہی رہا۔ بیدل کا راہوار فکر اپنے ہمعصروں کے لئے ذرا گریز پا تھا۔ اس امر کے ثبوت میں شہادت پیش کی جا سکتی ہے کہ ہند اور بیرون ہند کے معاصرین بیدل اور دوسرے دلدادگانِ نظم فارسی بیدل کے نظریہ حیات کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔"

جہاں تک دوسروں کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں تو وہ اپنے سر سے پگڑی اتار کر دوسروں کے سر پر باندھتے بھی نظر آتے ہیں۔ "اقبالنامہ" کے مؤلف پروفیسر شیخ عطاء اللہ نے اس کی ایک مثال "اقبالنامہ" کی دوسری جلد کے دیباچہ میں بدیں صورت پیش کی ہے :۔

"اقبال نے ۱۹۰۳ء میں "علم الاقتصاد" کے نام سے اردو میں اکنامکس پر سب سے پہلے کتاب تیار کی مجھے اس مضمون کے معلم کی حیثیت سے اور اس مضمون کو اپنی زبان میں منتقل کر دینے کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کتاب کے دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ جب لاہور سے احباب نے اس کتاب کے مہیا کرنے سے اپنی معذوری ظاہر فرمائی تو

میں نے کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں جستجو شروع کی، کتاب مل گئی اور میں نے بعد مطالعہ اسے کتب محفوظ میں داخل کرا دیا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے حضرت علامہ کی قابلیت اور خدمت اردو کی صلاحیت کا جو اندازہ مجھے ہوا، وہ ان حضرات کو ہرگز نہیں ہو سکتا جنہیں اس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اگرچہ اس میں اولیت کا شرف علامہ ہی کو حاصل تھا۔ اور انہوں نے جو راہ ہموار کر دی تھی اس پر گامزن ہونا چنداں مشکل نہ تھا۔ تاہم جب ۱۹۱۷ء میں علی گڑھ سے پروفیسر الیاس برنی کی کتاب "علم المعیشت" شائع ہوئی تو اقبال نے جو داد مصنف کو دی، وہ اقبال کی دیدہ وری حوصلہ، علم دوستی اور عظمت کی سرمایہ دار ہے مصنف کو لکھتے ہیں:۔

آپ کی تصنیف اردو زبان پر ایک احسانِ عظیم ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ اردو زبان میں علم الاقتصاد پر یہ پہلی کتاب ہے اور ہر پہلو سے کامل۔"

حکیم الامت کی زندگی میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ علمی مباحث میں ہر نکتے کو مدلل صورت میں شواہد کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کے قائل تھے۔ لیکن سکوتِ سخن شناس اور تحسین ناشناس کا اصول ان کے پیشِ نظر رہتا تھا۔ مثلاً ۱۹۰۴ء میں بابو عبدالمجید کے نام ایک خط میں کسی فنِ ناشناس پر ہلکے پھلکے انداز میں اس طرح طنز کرتے ہیں:۔

"یہ کوئی صاحب چھوٹے شملہ سے میری غزل کی اصلاح کر کے ارسال کرتے ہیں، میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کیجئے اور عرض کیجیے کہ بہتر ہو گا اگر آپ امیر و داغ کی اصلاح کیا کریں۔ مجھ گمنام کی اصلاح کرنے

سے آپ کی شہرت نہ ہوگی۔ میرے بے گناہ اشعار کو جو حضرت نے
تیغ قلم سے مجروح کیا ہے۔ اس کا صلہ انہیں خدا سے ملے میں بھی دعا
کرتا ہوں کہ خدا ان کو عقل و فہم عطا کرے۔ میں نے یہ دو حروف
محض از راہ ہمدردی تحریر کئے ہیں، امید ہے وہ برا نہ سمجھیں گے
اکثر انسانوں کو کنج تنہائی میں بیٹھے ہمہ دانی کا دھوکہ ہو جاتا ہے،
ان کا قصور نہیں، فطرت انسان ہی اس قسم کی ہے۔"

حبیب الرحمن خاں شروانی چونکہ سخن شناس تھے اس لئے انہیں خود ۲۵،
مئی ۱۹۰۶ء کو ایک خط میں ہر نظم پر تنقید کی دعوت ان الفاظ میں دیتے ہیں :۔

"نظرثانی کے وقت آپ کی تنقیدوں سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ اگر
میری ہر نظم کے متعلق آپ اس قسم کا خط لکھ دیا کریں تو میں آپکا نہایت
ممنوں ہوں گا۔"

مولانا گرامی بھی چونکہ سخن فہم اور سخن سنج تھے، اس لئے ان کی رائے
کو بھی اقبال بہت اہمیت دیتے تھے۔ خود بھی گرامی کے اشعار پر تنقید کرتے
تھے۔ دونوں پہلو گرامی کے نام ایک خط میں اس طرح ملتے ہیں :۔

"مہربانی کرکے غزل کے تمام اشعار پر اعتراض لکھئے تاکہ میں پورے
طور پر مستفید ہو سکوں۔ آپ نے صرف ایک شعر کی تعریف کر دی
اور باقی اشعار چھوڑ دیے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان پر اعتراض
کیجئے۔ آپ کے کسی شعر میں اگر کوئی بات مجھے کھٹکے میں بلا تکلف
عرض کر دیا کرتا ہوں۔ آپ کیوں ایسا نہیں کرتے ہے مجھے تعریف
سے اس قدر خوشی نہیں ہوتی جس قدر اعتراض سے کیونکہ اعتراض
کی تنقید سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔"

وہ عمل کی دنیا میں یقینِ محکم سے کام لینا ضروری سمجھتے تھے لیکن علم کے بارے میں یقین کم کرنے کا اس طرح مشورہ دیتے ہیں۔

ہمارے علم تا افتد بدامت — بیقین کم کن گرفتار شکے باش

یہی وجہ ہے کہ بعض صورتوں میں وہ ایک ہی موضوع کے متعلق اپنے مکاتیب میں مختلف حضرات سے مشورہ کرتے نظر آتے ہیں۔ کیمبرج سے خواجہ حسن نظامی کو بتاریخ ۸/ اکتوبر ۱۹۰۵ء لکھتے ہیں:۔

"اب ایک اور تکلیف دیتا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں، ان کا پتہ دیجئے۔ سپارہ اور رکوع کا پتہ لکھئے۔ اس بارہ میں آپ قاری شاہ سلیمان صاحب یا کسی اور صاحب سے مشورہ کرکے مجھے بہت جلد مفصل جواب دیں۔ اس مضمون کی سخت ضرورت ہے اور یہ گویا آپ کا کام ہے۔

قاری شاہ سلیمان صاحب کی خدمت میں میرا یہی خط بھیج دیجئے اور بعد التماس دعا عرض کیجئے کہ میرے لئے یہ زحمت گوارا کریں اور مہربانی کرکے مطلوبہ قرآنی آیات کا پتہ دیں۔

اگر قاری صاحب موصوف کو یہ ثابت کرنا ہو کہ مسئلہ وحدت الوجود یعنی تصوف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکلتا ہے تو وہ کون کون سی آیات پیش کرسکتے ہیں اور ان کی کیا تفسیر کرتے ہیں۔

کیا وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ تاریخی طور پر اسلام کو تصوف سے تعلق ہے کہ کیا۔ حضرت علی مرتضیٰ کو کوئی خاص پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی۔

غرضیکہ اس امر کا جواب معقولی اور منقولی اور تاریخی طور پر مفصل چاہتا ہوں۔ میرے پاس کچھ ذخیرہ اس امر کے متعلق موجود ہے، مگر آپ سے اور قاری صاحب سے استصواب ضروری ہے۔ آپ اپنے کسی اور صوفی دوست سے بھی مشورہ کر سکتے ہیں۔"

حکیم الامت کے کئی ایسے مکتوبات ہیں کہ جن کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ کسی علمی مجلسِ مشاورت میں بیٹھا ہے اور مستفید ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں یہ ان کا ایک منفرد انداز ہے۔ غالب نے بھی اپنے رقعات میں محفلیں سجائی ہیں لیکن ان میں نمایاں حیثیت ان کی اپنی ذات کو حاصل نظر آتی ہے، اس کے برعکس حکیم الامت کے مکتوبات میں ملتِ اسلامیہ کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے علم کو گرفتار کرنے کی جو منظم، مسلسل اور مؤثر کوشش حکیم الامت کے مکتوبات میں ملتی ہے، غالب کے خطوط میں نہیں ملتی۔

حقیقت یہ ہے کہ حکیم الامت کا طرزِ عمل فارسی اور اردو کے ہر بڑے شاعر سے مختلف نظر آتا ہے۔ غلو کی حد تک اپنی اور اپنے کلام کی تعریف اور ہجو کی حد تک اپنے ہمعصروں اور حریفوں پر نکتہ چینی تقریباً ہر شاعر کا شیوہ رہا ہے اور ہے لیکن ترجمانِ حقیقت کا اندازِ فکر اور اسلوبِ حیات اس سلسلے میں دوسروں سے بالکل جداگانہ ہے۔ نظم و نثر کی صورت میں انہوں نے جو تحریریں اپنی یادگار چھوڑی ہیں، ان کے مطالعہ سے یہی پہلو بے نقاب ہوتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حکیم الامت نے اس سلسلہ میں اس علمی اور تحقیقی ماحول کا اثر قبول کیا جو یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور سے مخصوص ہے۔ میں بلاخوفِ تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس عظیم تعلیمی ادارے کی فضا جس طرح آج محققین اور ناقدین کے لیے سازگار ہے، اسی طرح ان کی زندگی کے اس دور میں بھی تھی، جب وہ

...... اس سے وابستہ ہوئے تھے۔ بلند پایہ تحقیقی اور تنقیدی تصانیف اور تالیفات پیش کرنا اس ادارے کی ایک ایسی قابلِ قدر دیرینہ روایت ہے کہ جس کا اثر اس ادارے کے ہر طالبعلم اور معلم پر تھوڑا بہت زیادہ ضرور نظر آتا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں لیکن مشرقی زبانوں اور مشرقی ادب کے متعلق جس تحقیقی اور تنقیدی سرمایہ سے اورنٹیل کالج کا دامن مالا مال ہے۔ گورنمنٹ کالج، لاہور اس سے محروم ہے سچ تو یہ ہے کہ یہ دونوں ادارے ہماری ملت کی علمی تاریخ میں دو علیحدہ علیحدہ روایتوں کے ترجمان ہیں۔ گورنمنٹ کالج کو مغرب پر فریفتہ اور اورنٹیل کالج کو مشرق کا شیدائی کہا جاسکتا ہے گو حکیم الامت نے زمانہ طالبعلمی کے چار سال گورنمنٹ کالج میں گزارے لیکن ان کے ذوق اور مزاج پر ان کے گھریلو ماحول اور عظیم شفیق استاد علامہ میر حسن نے مشرق پسندی کا جو رنگ چڑھا دیا تھا، وہ ان پر گورنمنٹ کالج میں بھی غالب رہا۔ اس رنگ میں گہرائی، رعنائی اور توانائی اس وقت اور بھی بڑھ گئی۔ جب انہوں نے اورنٹیل کالج کی علمی اور ادبی دنیا میں قدم رکھا ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے پنجاب یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج اور اورنٹیل کالج کا متعلقہ ریکارڈ دیکھنے کے بعد اپنے مضمون " اقبال اور ینٹل کالج میں" جو تفصیلات پیش کی ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال پہلی بار ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۷ء تک طالبعلم کی حیثیت سے اورنٹیل کالج میں آتے رہے۔ اس عرصہ میں وہ باقاعدہ طالبعلم تو گورنمنٹ کالج کے تھے لیکن عربی اورنٹیل کالج میں پڑھتے تھے کیونکہ ۱۸۸۲ء میں گورنمنٹ کالج میں السنہ شرقیہ کی جماعتیں بند کر دی گئی تھیں اور عربی کے پروفیسر مولانا آزاد کو اورنٹیل کالج میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۱۲ء تک گورنمنٹ کالج کے طلباء عربی، فارسی اور سنسکرت اورنٹیل

کالج میں پڑھتے رہے۔ دوسری بار وابستگی کی صورت یہ تھی کہ علامہ اقبال ۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم۔ اے کرنے کے بعد اسی سال ۱۳ مئی کو اورینٹل کالج میں میکلوڈ عریبک ریڈر مقرر ہو گئے اور ۱۳ مئی ۱۹۰۳ء تک اسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس عرصہ میں ۱۹۰۱ء کے وہ چھ ماہ بھی شامل ہیں جب انہوں نے اورینٹل کالج سے چھ ماہ کی بلا تنخواہ رخصت لے کر گورنمنٹ کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیئے تھے
۱۸۷۰ء میں جب پنجاب یونیورسٹی کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ تو چند ریسرچ سکالرشپ کی اسامیاں بھی منظور کی گئیں۔ ان میں سے ایک کا نام میکلوڈ پنجاب عربک فیلوشپ تھا۔ ان کا مقصد مغربی علوم وفنون کو دیسی زبانوں (اردو ہندی) میں منتقل کرنے کے علاوہ مشرقی السنہ و ادبیات (عربی، فارسی، سنسکرت) کو ترقی و وسعت دینا بھی تھا۔ (یہ ۱۹۵۵ء تک پنجاب یونیورسٹی کے کیلنڈر میں کے طور پر شائع ہوتے رہے ہیں) میکلوڈ پنجاب عربک فیلوشپ اس عطیے کے منافع سے قائم کی گئی تھی جو لفٹیننٹ گورنر پنجاب سر ڈانلڈ میکلوڈ کی یادگار کے طور پر پنجاب کے راجاؤں اور دیسی اور ولایتی صاحبان نے دیا تھا۔ ان عطیات سے صرف ۷۵ روپے ماہوار منافع ہوتا تھا۔ مگر گورنر کی خواہش پر یونیورسٹی نے اس فیلوشپ کے لئے ایک سو روپے ماہوار مقرر کر دیئے تھے۔ اس فیلوشپ کے فرائض یہ تھے کہ سینٹ کی ہدایات کے بموجب عربی وغیرہ کی جو کتابیں مرتب ہو کر پنجاب یونیورسٹی کالج کی معرفت چھپیں، ان کا اہتمام کیا جائے اور انگریزی عربی ادبیات اور علوم وفنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ نیز تدریسی کام کیا جائے۔ اکتوبر ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کالج کو جب مکمل یونیورسٹی کا درجہ مل گیا تو فیلو کی بجائے اس منصب کا نام ریڈر ہو گیا۔ لیکن منصبی فرائض اور تنخواہ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اورینٹل

کالج کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۸۹۹ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے شیخ عبدالقادر جیلانی کے پیش کردہ نظریہ توحید مطلق کو مرتب کیا تھا سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۰۰ء سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) تاریخ کے موضوع پر STUBBS کی تصنیف EARLY PLANTAGANENTS کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کی تلخیص کی (۲) علم الاقتصاد کے موضوع پر WOLKOR کی تصنیف POLITICAL ECONOMY کو اردو میں منتقل کیا اور اس کی تلخیص کی۔

(۳) علم الاقتصاد پر ایک نئی تصنیف مرتب کی۔ غالباً یہی وہ کتاب ہے جس کا ذکر اقبال نامہ کے مؤلف شیخ عطاء اللہ کے حوالہ سے میں پہلے کر چکا ہوں اس کتاب کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کی تحریک آرنلڈ کی طرف سے ہوئی۔ پروفیسر جیارام اور فضل حسین کے کتاب خانوں سے استفادہ کیا گیا اور علامہ شبلی نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح کی۔

مختلف کلاسوں کو مختلف مضامین پڑھانے کی صورت یہ تھی۔

ایف۔ اے۔ ایل (سال اول و دوم)

تاریخ اور اقتصادیات (ہفتے میں چھ پیریڈ)

۱۔ سیلے (SEELAY) کی کتاب EXPANNION OF ENGLAND

۲۔ تاریخ ہندوستان اور انگلستان پر نوٹس۔

۳۔ FAWCETT کی تصنیف POLITIEAL EEONONRY

انٹرمیڈیٹ (سال دوم)

فلسفہ (ہفتے میں چھ پیریڈ)

۲۔ RAY کی تصنیف DEDUCTNIE LOGIE

۱۔ LOAEL کی تصنیف PRIMER OF PSYCHOLOSY

انٹرمیڈیٹ (سال اوّل)

فلسفہ (ہفتے میں چھ پیریڈ)

۱۔ RAY کی تصنیف WEDNCTNIE LOGIE

مندرجہ بالا کوائف سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اورینٹل کالج میں علامہ اقبال کا کام صرف پڑھانا نہیں تھا۔ تصنیف و تالیف کا کام بھی ان کے فرائض میں شامل تھا، یہی فرائض انجام دیتے ہوئے، انھوں نے "نظریہ توحید مطلق" مرتب کرنے کی صورت میں جو کام کیا، وہ ان کا اپنی منزل کی طرف پہلا قدم ثابت ہوا اس کے ساتھ ریسرچ سکالروں کا سفر شروع ہو گیا۔ انھوں نے شعر گوئی کے ساتھ ساتھ مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا اخبارات اور رسائل تک رسائی حاصل کر لی۔ ۱۹۰۳ء میں "علم الاقتصاد" کی اشاعت کے ساتھ مصنفین کی صف میں شامل ہو گئے۔ میری نظر میں اس تصنیف کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کے اپنے بیان کے مطابق اس پر نظرثانی اس دور کے مشہور محقق اور نقاد مولانا شبلی نے کی تھی۔ جن کا شمار گو اردو ادب کے عناصر خمسہ میں ہوتا ہے۔ لیکن جو فارسی زبان پر بھی کامل قدرت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ فارسی شعر کو سمجھنے، جانچنے اور پرکھنے کی لاجواب صلاحیت کے مالک تھے۔ فارسی میں ان کا ایک شعری مجموعہ بھی موجود ہے۔ جو واقعی دستہ گل ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ مولانا شبلی کے پروفیسر آرنلڈ اور عطیہ فیضی سے گہرے مراسم تھے۔ بعد میں ان دونوں... شخصیتوں سے علامہ اقبال کے تعلقات اتنے استوار ہوئے کہ ان کے مشورے علامہ کی علمی اور ادبی سرگرمیوں پر اثر انداز ہوتے رہے۔ ان کے علاوہ

دو شخصیتیں اور ایسی ہیں کہ جن کے تعلقات اس دور میں مولانا شبلی اور علامہ اقبال کے ساتھ بہت گہرے تھے۔ میرا اشارہ سرعبدالقادر اور مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کی طرف ہے۔ چونکہ جس دور میں علامہ اقبال نے علم الاقتصاد مکمل کی۔ اس دور میں پروفیسر آرنلڈ لاہور میں پہنچ چکے تھے، اس لئے ممکن ہے کہ انہوں نے ہی علامہ اقبال کو اپنی تصنیف مولانا شبلی سے نظرثانی کروانے کا مشورہ دیا ہو۔ رابطے کی یہ صورت پیدا ہونے کے بعد علامہ اقبال کا مولانا شبلی سے ذہنی فاصلہ اتنا کم ہو گیا کہ وہ ظاہری فاصلہ کم کرنے کے لئے بھی کوشش کرتے رہے۔ سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک خط میں ۱۲ر نومبر ۱۹۱۶ء کو لکھتے ہیں:-

"مولانا شبلی مرحوم کی زندگی میں میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مولانا مرحوم پنجاب میں مستقل طور پہ اقامت گزیں ہو جائیں مگر مسلمان امرا میں مذاق علمی مفقود ہو چکا ہے۔ میری کوشش بارآور نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ دار المصنفین کے کام میں برکت دے اور آپ کا وجود مسلمانوں کے لئے مفید ثابت کرے۔"

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر میں یہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں اورنٹیل کالج کے ماحول پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی کے علمی اور تحقیقی رجحانات نے علامہ اقبال کو اس راہ پر چلنے کے لئے آمادہ کر دیا کہ جو ایک محقق کی راہ تھی جس پہ تنقید کے سہارے محقق کو آگے بڑھنا تھا۔ داخلی اور خارجی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ محقق اور نقاد اقبال نے اپنی راہ متعین کرنے کے بعد اپنی منزل مقصود یا اپنی تحقیق کا میدان بھی متعین کر لیا۔ اور یہ میدان تھا۔ ملت اسلامیہ کے زوال کے اسباب اور ان کا تدارک۔ میری یہ رائے ہے کہ نظریہ توحید

مطلق کے سال ترتیب ۱۹۰۱ء سے لے کر تا دمِ آخر حکیم الامت انفرادی اور اجتماعی صورت میں اپنے اسی ریسرچ پروگرام کی تکمیل کے لئے کوشاں رہے انہوں نے اپنی تحقیق کے نتائج اور اپنی تنقید کے فیصلوں کے اظہار کے لئے جہاں مختلف زبانوں سے کام لیا۔ وہاں کسی ایک ہیئت کی پابندی کو بھی گوارا نہ کیا تحریر اور تقریر، شعر اور نثر ہر صورت سے فائدہ اٹھایا۔ اولین حیثیت اپنے خیالات کو دی، اور ثانوی حیثیت صورتِ اظہار کو۔ شیخ عبد القادر نے بانگِ درا کے دیباچہ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ:۔

" ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں اور قسم کھالیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے، اسے کسی اور مفید کام میں صرف کریں گے ۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے، جسے ترک کرنا چاہئے بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے۔ اس لئے ایسی مفید خدا داد قابلیت کو بیکار کرنا درست نہ ہو گا شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے۔ اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادے ترکِ شعر کو بدل دیں اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترکِ شعر اختیار کیا جائے میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لئے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں، وہ ان کے لئے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لئے بھی مفید ہے۔"

اس اقتباس سے چار سوال میرے سامنے آتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ

شعر گوئی ترک کرنے کی صورت میں وہ وقت جو شاعری میں صرف ہوتا ہے. کسی دوسرے مفید کام میں صرف ہوتا!

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ہم شعر گوئی ترک نہ کرنے کے فیصلہ کو علمی دنیا کی خوش قسمتی قرار دے سکتے ہیں!

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا ہماری درماندہ قوم اور کم نصیب ملک کے امراض کا علاج کرنے کے لئے شاعری کی ضرورت تھی یا نثر کی!

چوتھا سوال یہ ہے کہ اس فیصلہ کے بعد حکیم الامت کی اپنی شاعری کے متعلق کیا رائے تھی!

ان سوالات کے جوابات علامہ اقبال کی اپنی تحریروں کے پیش نظر بدیں صورت دیے جا سکتے ہیں ا۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ان کا وقت تحقیق و تنقید میں صرف ہوتا کیونکہ شعر گوئی ترک کرنے یا نہ کرنے کے فیصلہ کے وقت سے پہلے اور بعد میں وہ جس دوسرے کام میں غیر معمولی دلچسپی لیتے نظر آتے ہیں، وہ تحقیق و تنقید سے متعلق ہے مجھے کامل یقین ہے کہ اگر شاعری ترک کر دیتے تو فقہ، اجتہاد اور قرآن حکیم کے متعلق تمام مجوزہ کتب مکمل کر لیتے کے علاوہ بعض دوسری ایسی تحقیقی معرکتہ الآرا تصانیف پیش کرتے کہ جن کی اہمیت کسی طرح بھی ان کے شعری مجموعوں سے کم نہ ہوتی۔ ان کے مکاتب میرے اس دعوئی کے شاہد ہیں۔

دوسرے سوال کے جواب کی یہ صورت ہے کہ شعر کا تعلق جذبے اور دل سے اور علم کا تعلق عقل اور دماغ سے ہے۔ جوش کہتا ہے۔

علم سے بڑھتی ہے عقل اور عقل ہے وہ بد دماغ

جو بجھا دیتی ہے سینے سے محبت کا چراغ

دریں صورت مجھے سر عبد القادر کے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ شعر گوئی ترک نہ کرنے کے فیصلہ سے علمی دنیا کی خوش قسمتی ثابت ہوتی ہے۔ اگر یہ صورت ہوتی تو حکیم الامت خود حضور رسالت مآب میں یہ شکایت نہ کرتے

من اے میر امم داد از تو خواہم   مرا یاران غزل خوانے شمردند

اس کے علاوہ "علم الاقتصاد" کے دوسرے ایڈیشن کا مقدمہ لکھتے ہوئے مشہور ماہر اقتصادیات ڈاکٹر انوار اقبال قریشی کو یہ لکھنا پڑا ہے۔

"اس کتاب کے پڑھنے کے بعد میری رائے تو یہ ہے کہ اقبال نے اپنے معاشیات کے شوق کو ترک کر کے قوم پر ایک گونہ ظلم کیا ہے۔ اگر وہ معاشیات سے بھی اپنی دلچسپی کو برقرار رکھتے تو مسلمانوں میں ممتاز ماہرین معاشیات کا وہ فقدان نہ ہوتا جو آج رہا ہے۔"

مجھے ڈاکٹر قریشی کی رائے سے مکمل اتفاق ہے کیونکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس دور میں کسی قوم کی تقدیر کو بدلنے کے لئے ماہرین اقتصادیات کی شاعروں سے بھی زیادہ ضرورت تھی، جہاں تک برصغیر کے مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے پاس اقبال سے پہلے میر، سودا، نظیر اکبر آبادی، میر انیس، حالی اور داغ جیسے عظیم شاعر تو موجود تھے لیکن ماہر اقتصادیات ایک بھی نہیں تھا۔ شبلی، حالی اور آزاد کے علاوہ صف اول میں شامل ہونے والا کوئی محقق اور نقاد بھی نہیں تھا۔

تیسرے سوال کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اگر درماندہ قوم کے امراض کے علاج کے لئے شاعری کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے احباب اور نیازمندوں کو مختلف تحقیقی مضامین اور تصانیف پیش کرنے کے لئے آمادہ نہ کرتے بلکہ خود بھی استاد داغ کی طرح "اصلاح کلام" کے لئے کوئی دفتر کھول لیتے۔ اس کے برعکس وہ تصنیف و تالیف کے ادارے، تحقیقی مرکز اور علمی و ادبی انجمنیں

قائم کرنے میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ اور ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جو اس قسم کے کام کرنے والے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کو بھی درماندہ قوم کے امراض میں سے ایک مرض سمجھتے تھے۔

چوتھے سوال کا جواب ہے کہ حکیم الامت، تو خود کی اپنی شاعری سے مطمئن تھے اور نہ ہی یہ چاہتے تھے کہ ملت ان کی شاعری کو ہی کافی سمجھے۔

مندرجہ بالا سوالات اور جوابات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں یہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ سر عبدالقادر اور پروفیسر آرنلڈ کے مشورہ سے علمی دنیا کو فائدہ کی بجائے یہ نقصان پہنچا کہ ملتِ اسلامیہ کے مفاد کی خاطر حکیم فرزانہ جو تصانیف معرضِ وجود میں لانا چاہتے تھے، ان کی صورت خاکوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ قرآن حکیم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کرنے کی وہ تمنا پوری نہ ہو سکی، جس کا اظہار سر سید راس مسعود کے نام ایک خط میں اس طرح ہوا ہے:۔

"چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں"۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حکیم الامت قرآن پاک کے متعلق اپنے افکار بالکل بیان نہ کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی دلی خواہش کے مطابق جس صورت میں قرآنی افکار کا اظہار چاہتے تھے، اظہار نہ کر سکے۔ ورنہ انہوں نے اپنی زندگی میں نثر یا شعر کی صورت میں جو کچھ کہا ہے، اس کا تعلق بنیادی طور پر اور نمایاں رنگ میں قرآن حکیم ہی سے ہے، میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی مثنوی "اسرارِ خودی" میں جو مندرجہ ذیل دو باتیں لکھی ہیں، وہ ان کی پوری شاعری میں صادق آتی ہیں:۔

پہلی بات یہ ہے کہ مثنوی لکھنے کا مقصد شاعری کے جوہر دکھانا نہیں ہے فرماتے ہیں:۔

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست   بت پرستی، بت گری مقصود نیست

دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے اس مسلکِ مثنوی میں قرآن حکیم سے حاصل کردہ موتی پروئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

گوہر دریائے قرآں سفتہ ام ‏ ‏ شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

یہ باتیں انہوں نے ۱۹۱۴ء میں کہی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں پہلے سے بھی زیادہ زور پیدا ہوتا گیا۔ وہ انسان کے ہر قول و فعل کو قرآن اور اسلام کے حوالے سے دیکھنے لگے اور ان سب نظریات اور عقائد کے خلاف ہو گئے جو قرآنی افکار سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ ۱۲، دسمبر ۱۹۳۶ء کو مولوی ظفر احمد صدیقی کو لکھتے ہیں:-

• جنابِ من (۱) معترض . . . قرآن کریم کی تعلیم سے بے بہرہ ہے . . . علیٰ ہذا القیاس۔ اسلامی تصوف میں مسئلہ خودی کی تاریخ اور نیز میری تحریروں سے ناواقف محض ہے۔ مؤخر الذکر صورت میں میں اسے معذور جانتا ہوں . . . (۲) دینِ اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدے کی رو سے ہر شے پر مقدم ہے نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود معین کرتا ہے۔ اس حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔ خودی خواہ مسولینی کی ہو یا ہٹلر کی گروہ قانونِ الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لیے پامال کیا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں۔ دوسری صورت میں قانونِ الٰہی اور اخلاق کی

پابند ہے۔ بہر حال حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور
شریعت اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت
ہے۔ جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ
خودی کے پرائیوٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف
رضائے الٰہی اس کا مقصد ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو
بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے بعض نے اسی کا نام بقا
رکھا ہے لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر
فلسفہ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ
ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے
عقیدہ کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک
تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف
ایک قسم کی بغاوت ہیں۔"

حکیم الامت کی زندگی کے دورِ اول سے لے کر دورِ آخر تک اسلام
اور قرآن سے لگاؤ اور ملت اسلامیہ سے محبت کی جو صورت گزشتہ سطور میں
پیش کی گئی ہے، وہ رسمی، روایتی اور سرسری نوعیت کی نہیں ہے بلکہ ایک محقق
اور نقاد کے وسیع مطالعہ، گوناگوں مشاہدات، متنوع تجربات اور طویل و
عریض شعوری ادوار پر مبنی اس تحقیق اور چھان بین اور گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے
جس سے کام لینے کا فن حکیم الامت نے پہلی بار اورینٹل کالج میں ریسرچ سکالر
کی حیثیت سے سیکھا تھا۔ اورینٹل کالج سے فارغ ہو کر یورپ میں پہنچے تو وہاں
بھی ایسا ماحول ملا کہ جس میں تحقیق و تنقید ہی کے سلسلہ میں زیادہ باتیں
ہوتی تھیں۔ اس دور کے ان ہندوستانی طالب علموں میں سے جو یورپ میں

تعلیم حاصل کر رہے تھے اور جن سے علامہ اقبال کے روابط بڑھے ۔سید امیر علی عبد اللہ بہرروری، پروفیسر محمود شیرانی، سر عبد القادر۔ اور عطیہ فیضی خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر شیرانی کو ایک محقق کی حیثیت سے جو منفرد مقام حاصل ہے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کے علاوہ انگلستان اور جرمنی میں ڈاکٹر میک ٹیگرٹ، براؤن، نکلسن اور سارلی جیسے بلند پایہ علماء سے ان کا رابطہ قائم ہوا۔ ان میں سے پروفیسر براؤن خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔ کیونکہ ان کو ایک مستشرق کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل ہے اور وہ ایران کی ادبی تاریخ کو چار ضخیم جلدوں میں پیش کرنے کا کارنامہ انجام دے چکے ہیں تحقیق اور تنقید کے نقطہ نظر سے یہی وہ میدان ہے جس میں شبلی اس دور میں اپنا راہوار قلم دوڑا رہے تھے۔ ایس۔ ایم اکرام کی تصنیف یادگار شبلی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۵ء تک شبلی علم الکلام، الکلام اور سوانح مولانا روم مکمل کر چکے تھے اور شعر العجم لکھنے کے سلسلہ میں مصروف رہے تھے۔

یہی وہ دور ہے جس میں حکیم الامت نے فلسفہ عجم کے متعلق تحقیقی مقالہ لکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ مقالہ ایک ایسا تحقیقی کارنامہ ثابت ہوا کہ علمی دنیا میں اس کی شہرت کا ضامن بن گیا اور جسے آج بھی مشرقی ادب اور مشرقی فکر کا مطالعہ کرنے کے سلسلے میں ایک سند کی حیثیت حاصل ہے اس مقالہ پہ ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ اور اسے ایک ہندوستانی کے قلم سے انگریزی میں لکھا ہوا ہونے کے باوجود اتنا اہم سمجھا گیا کہ اسے لندن کے ہی ایک تاجر نے ۱۹۰۸ء میں شائع کر دیا۔ یہ مقالہ لکھتے ہوئے محقق اقبال نے یہ محسوس کیا کہ ملت اسلامیہ کے زوال کی ایک بڑی وجہ عجمی تصوف ہے۔ مرض کی اس تشخیص نے ان کو صحیح معنوں میں حکیم الامت کے لقب کا مستحق بنا دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ

مرض کی ایک وجہ سے آشنا ہونے کے بعد حکیم الامت نے اپنی تحقیقی سرگرمیاں جاری رکھیں اور ملتِ اسلامیہ کے زوال کے دوسرے اسباب اور ان کے تدارک کے موضوع پر تادمِ آخر تحقیق کرتے رہے۔ اپنے تنقیدی شعور سے انہوں نے جو سمجھا اور تحقیقی نظر سے جو کچھ دیکھا، اسے کبھی فارسی یا اردو اشعار کی صورت میں اور کبھی اردو یا انگریزی نثر کے روپ میں قارئین اور سامعین کے سامنے پیش کر دیا۔ بالفاظِ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں نے ان کی شاعری کو متاثر کیا اور ان کی نثر کو ایک مخصوص رنگ بخشا۔

یہی وجہ ہے کہ حکیم الامت نے فلسفۂ عجم کے بعد جب "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" کو پیش کیا تو ادب اور زندگی کے گہرے رشتے اور ادب کے مقصدی اور اصلاحی پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حافظ کی شاعری کو زہرِ اجل قرار دیا۔ کیونکہ اس سے ترکِ دنیا کی تعلیم ملتی تھی جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اس اظہارِ حقیقت نے انہیں ایک متنازعہ شخصیت بنا دیا۔ یہ مرحلہ ان کی زندگی میں ایسا تھا کہ اگر وہ ریسرچ سکالر نہ ہوتے تو تحقیق اور تنقید کے اعلیٰ اصولوں کو نظرانداز کر کے غالب کی طرح جنگِ عزت کے مقدموں میں الجھ جاتے لیکن حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہوش کا دامن سنبھالے رکھا اور ضبط سے کام لیا۔ گو پیرزادہ مظفر احمد فضلی نے علامہ کی مثنوی کا جواب لکھتے وقت انہیں اچھے لفظوں میں یاد نہ کیا۔ لیکن علامہ نے ان کا ذکر جہاں بھی کیا، اچھے لفظوں میں کیا البتہ اس بات کا انہیں بہت افسوس تھا کہ پیرزادہ صاحب نے ان کی مثنوی کی روح کو نہیں سمجھا ہے۔ جب اس قلمی جنگ میں اکبر الہ آبادی اور خواجہ حسن نظامی بھی شریک ہو گئے تو انہوں نے ان کو اور سید سلیمان ندوی، اسلم جیراجپوری

اور نخر الدین پال کو جو خطوط لکھے وہ اس حقیقت کے ترجمان ہیں۔ کہ علامہ صرف حق کے متلاشی تھے۔ وہ علمی معاملات میں ضد اور ہٹ دھرمی کے قائل نہیں تھے، وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ اصولی بحثوں کو شخصی رنگ دے دیا جائے۔ اس سلسلہ میں انہیں جب اپنی لغزش کا احساس ہوا اور اصل مسئلہ سلجھنے کے بجائے الجھتے دیکھا تو ایک سچے محقق کی طرح حافظ کے متعلق قابل اعتراض اشعار اپنی مثنوی میں سے حذف کر دیئے۔ اور ادب اور قوم یا معاشرہ کے تعلق کو ایک ایسے نظریے کی صورت میں پیش کر دیا کہ جس کو معیار بنا کر کسی بھی زبان کے ادب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اور علمی تقاضوں کے نقطہ نظر سے اس کی قدر و قیمت متعین کی جا سکتی ہے۔ اس واقعہ کو میں شاعر اقبال کی شکست اور محقق اقبال کی جیت قرار دیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس واقعہ کا ان پر یہ اثر ہوا کہ انھوں نے شخصیات پر تحقیق و تنقید کرنے کی بجائے مختلف مسائل اور اجتماعی نوعیت کے موضوعات پر اظہار خیال مناسب سمجھا۔ ادب کو تاریخی اور معاشرتی پس منظر میں سمجھنے، جانچنے اور پرکھنے کی بہت عمدہ مثالیں ان کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ مثلاً ۱۹ر جولائی ۱۹۱۶ء کو سراج الدین پال کو لکھتے ہیں :

"تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوئی، اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا جس قوم میں طاقت اور توانائی مفقود ہو جائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی۔ تو پھر اس قوم کا نقطہ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانائی ایک حسین اور جمیل شے ہو جاتی ہے۔ اور ترکِ دنیا موجب تسکین۔ اس ترک دنیا کے پردے میں ضعیف قومیں اپنی سستی اور کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا

میں نصیب ہوتی ہے، چھپایا کرتی ہیں، خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے، ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔"

"اسرارِ خودی" (۱۹۱۴ء) اور "رموزِ بیخودی" (۱۹۱۸ء) کے بعد حکیم الامت نے جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے "مغربی دیوان" کے جواب میں تقریباً سو سال بعد ۱۹۲۳ء میں "پیامِ مشرق" سنایا۔ اس مجموعہ کے تحقیقی اور تنقیدی پہلو کا اندازہ اس کے دیباچہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ گوئٹے کا دیوان کن اثرات کا نتیجہ تھا اور کن حالات میں لکھا گیا۔ دیباچہ میں اس سوال کا جواب دینے کے بعد حکیم الامت "پیامِ مشرق" کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و قوم کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضروری ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں، ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے، یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی، جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن شائن اور برگسانی کی تصانیف میں ملتا ہے۔ یورپ نے اپنے علمی، اخلاقی اور اقتصادی

نصب العین کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں اور ...
سائنیورنیٹی (سابق وزیر اعظم اطالیہ) سے انحطاطِ فرنگ کی دلخراش داستان
بھی سن لی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کے نکتہ رس مگر قدامت پرست
مدبرین اس حیرت انگیز انقلاب کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے۔ جو انسانی
ضمیر میں اس وقت واقع ہو رہا ہے۔ خالص ادبی اعتبار سے دیکھیں
تو جنگِ عظیم کی کوفت کے بعد یورپ کے قوائے حیات کا انحلال
ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کی نشو و نما کے لئے نا مساعد ہے بلکہ
اندیشہ ہے کہ اقوام کی طبائع پر وہ فرسودہ اسست رگ اور زندگی
کی دشواریوں سے گریز کرنے والی جمعیت غالب نہ آجائے جو جذباتِ قلب
کو افکارِ دماغ سے تمیز نہیں کر سکتی۔ البتہ امریکہ مغربی تہذیب کے عناصر
میں ایک صحیح عنصر معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ ملک
قدیم روایات کی زنجیروں سے آزاد ہے اور اس کا اجتماعی وجدان
نئے اثرات و افکار کو آسانی سے قبول کر سکتا ہے۔

مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند
کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی
اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے
اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا
خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے
انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو
قرآن نے اِنَّ اللہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ
کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور

اجتماعی دونوں پہلوؤں پہ حاوی ہے۔ اور میں نے اپنی فارسی
تصانیف میں اسی صداقت کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس میں جس صداقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، میرے خیال میں حکیم الامت اس صداقت تک شاعر کی صورت میں نہیں بلکہ محقق کی حیثیت سے پہنچے تھے اور اس صداقت کو انہوں نے صرف اپنی تصانیف میں ہی نہیں ہر تحریر اور تقریر میں مدِ نظر رکھا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو، فارسی اور انگریزی میں ان کے جتنے بھی شعری یا نثری مجموعے ان کی زندگی یا ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے ہیں، ان کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ بات ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ مندرجہ بالا صداقت کے اظہار کے لئے ان کا اسلوبِ بیان محض بیانیہ (NARRATIVE)، محاکاتی (DESCRIPTINE) یا جذبہ آمیز (EMOTIONAL) نہیں ہے بلکہ تشریحی (EXPLANATORY) تنقیدی (CRITICAL) تجزیاتی (ANALYTICAL) اور تحقیقی (SCHOLARLY RESEARCH) ہے بلکہ کہیں کہیں طنزیہ (IRONICAL) بھی ہے۔ یہ پہلو جن تصانیف کا پہلے ذکر ہو چکا ہے ان کے علاوہ ضربِ کلیم، انگریزی خطبات کے مجموعے اسلامی الہیات کی جدید تشکیل (RECONSTRUCTION OF RELIGIONS THONGUT IN ISLAM) اور اردو تقاریر اور مقالات کے مجموعوں میں خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔

ضربِ کلیم کے آغاز میں حکیم الامت ناظرین سے فرماتے ہیں:۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام — میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل! نہ جل ترنگ

زندگی کے حقائق پہ نظر رکھنے کی دعوت درحقیقت تحقیق کے فن کو اپنانے

کی دعوت ہے۔ انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ مسلمان دورِ غلامی میں اس فن سے بیگانہ ہو چکے یہی وجہ ہے کہ اس مجموعہ میں شامل نظم بعنوان "اجتہاد" میں یہ شکایت کرتے ہیں کہ ؎

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق

حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

مسئلہ اجتہاد حکیم الامت کے محبوب موضوعات میں سے ایک ہے، اس موضوع پر انہوں نے خود بھی لکھا اور دوسروں کو بھی لکھنے کی دعوت دی سید سلیمان ندوی کو ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء والے خط میں لکھتے ہیں:

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اس بحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی جو میری نظر سے گزری ہے مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے، مصنف نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا، موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا۔ میں نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا۔ مگر میرا دل بعض امور کے متعلق خود مطمئن نہیں، اس واسطے اس کو اب تک شائع نہیں کیا۔"

اپنی تحقیقی کاوش کے متعلق خود ہی عدم اطمینان کا اظہار اور خوب سے خوب تر کی تلاش حقیقت کے متلاشی ... ایک محقق کا ہی طریق کار ہے۔ وہ

وہ صرف حق سننے کے لئے ہر در پر دستک دیتا ہے کہیں کامیاب ہوتا ہے اور کہیں ناکام۔ ایسی ہی ایک کوشش ۸ ر اگست ۱۹۳۲ء کو حکیم الامت پیر سید مہر علی شاہ کو خط لکھتے ہوئے اس طرح کرتے ہیں ؛۔

"گو مجھے اندیشہ ہے کہ اس خط کا جواب لکھنے یا لکھوانے میں جناب کو زحمت ہوگی بہر حال جناب کی وسعت اخلاق پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی اور دروازہ نہیں جو پیش نظر مقصد کے لئے کھٹکھٹایا جائے۔"

اجتہاد کی نوعیت اور ضرورت کا احساس اس خط سے بھی بخوبی ہوتا ہے جو ۲۰ ستمبر ۱۹۱۵ء کو صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کو لکھا گیا تھا۔

"قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال (مسئلہ اجتہاد) پیدا ہونے والا ہے مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآن کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہ کا نظیر ناممکن ہے۔ مذہب اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ بیادتِ

انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد قرآن میں موجود ہیں۔ جو جو قواعد
عبادات یا معاملات (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام
میں اس وقت مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطہ نگاہ سے تنقید کی جائے
اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو
شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس
(JURISPRUDENCE) یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی
نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام
کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم۔"

مکتوبات کے علاوہ حکیم الامت نے اپنے مشہور انگریزی خطبات میں بھی
اجتہاد کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ خطبات "مذہبی اور فلسفیانہ مسائل
کو تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے پیش کرنے کا ایک قابلِ قدر نمونہ ہیں۔ ان خطبات
کی ضرورت اور ان کے مقاصد کو حکیم الامت نے خود بقول خلیفہ عبدالحکیم اس طرح
بیان کیا ہے:-

جدید انسان کی تعلیم و تہذیب اور اس کی نفسیات ازمنۂ ماضیہ سے
بہت کچھ مختلف ہو گئی ہے، قدیم انداز کا فکر و ذکر اس کے لئے
یقین آفرین اور دلنشیں نہیں رہا۔ ہمارے علمائے دین اور صوفیہ
اس انداز کو باقی رکھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، جس کو مرورِ
ایام نے بے اثر کر دیا ہے۔ روحانی تجربہ والے لوگ اپنے اندازِ
فکر میں کوئی مناسب تبدیلی پیدا نہ کر سکے۔ اس لئے قدرتی طور
پر یہ تقاضا پیدا ہو گیا کہ علم دین کو سائنٹیفک یا حکیمانہ انداز
میں پیش کیا جائے میں نے اس تقاضے کو ان خطبات میں ایک

حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے میرا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی فلسفہ اس انداز میں پیش کیا جائے کہ اسلام کی فلسفیانہ روایات کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا جائے اور جدید افکار سے بھی ثبوت مہیا کیا جائے۔ قدیم و جدید کے اس امتزاج سے فکرِ اسلامی ایک نئی شکل اختیار کر سکتا ہے موجودہ زمانہ اس کوشش کے لئے بہت موزوں ہے۔ کلاسیکی طبیعات نے اپنی اساس پر ایک گہری تنقیدی نظر ڈالی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ طبیعات سے پیدا شدہ مادیت جو سائنس کے اصولِ موضوعہ کا ایک لازمی نتیجہ تھی، رفتہ رفتہ ناپید ہو رہی ہے اور وہ زمانہ دور نہیں کہ دین و دانش، مذہب و سائنس، وہ ہم آہنگی محسوس کرنے لگیں جو پہلے نظر سے اوجھل تھی لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ فلسفیانہ افکار اور قیاس آرائی میں کوئی قطعیت نہیں ہوتی۔ علم کی ترقی سے فکر کی نئی نئی راہیں کھلیں گی جن کی بدولت میری پیش کردہ تاویلات سے بہتر تاویلات کا امکان ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ فکرِ انسانی کے ارتقاء پر نظر رکھیں اور آزادانہ تنقید کا اسلوب قائم رکھیں۔"

(فکرِ اقبال۔ خلیفہ عبدالحکیم)

اپنی تاویلات سے بہتر تاویلات کے امکان کا اظہار اور فکرِ انسانی کے ارتقاء پر نظر رکھنے اور آزادانہ تنقید کے اسلوب کی پاسداری کو فرض قرار دینا صرف اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جو بنیادی طور پر محقق اور نقاد ہو۔ حکیم الامت کی اپنی تحریروں یا تقریروں سے جو اقتباسات پیش کئے گئے ہیں، ان سے اسی

پہلو کی نشاندہی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی زندگی کے دورِ اول سے دورِ آخر تک وہ اپنی اسی حیثیت کو پبلک کے سامنے لانے کی کوشش کرتے رہے انفرادی صورت میں بھی اور اجتماعی شکل میں بھی اپنی شاعری سے بیزاری کا اظہار انہوں نے کئی بار کیا ہے۔ لیکن اپنی تحقیقی کوششوں کے وہ ہمیشہ دلدادہ ہی رہے سازِ سخن تو صرف ناقۂ بے زمام کو سوئے قطار کھینچ لانے کا ایک بہانہ ہے۔ حالات اور واقعات نے جب یہ ثابت کیا کہ مارتِ تو نشانہ سے بے خبر لیکن بہانہ کی شیدائی منزل سے بیگانہ لیکن راہ کی متلاشی اور باطن سے برسرِ پیکار لیکن ظاہر کی پرستار ہے، تو انہیں ۲۰ر اگست ۱۹۳۵ء کو سید سلیمان ندوی کے نام مکتوب میں بصراحت یہ اعلان کرنا پڑا۔

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی، ہاں بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں۔ جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ:

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست
کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

(اقبال)

علامہ اقبال کی قرآن دوستی کا جائزہ

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

(اقبال)

تاریخ شاہد ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکام رہنے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کا زوال انتہائی صورت اختیار کر گیا اور مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ایک ایسے دور کا آغاز ہوا جو اپنے دامن میں گوناگوں مصائب اور مشکلات لئے ہوئے تھا۔ ایک طرف فرنگی حکمران نشۂ اقتدار سے چور اور دوسری طرف ہندو صدہا سال کی غلامی کے بعد آتشِ انتقام سے بے قرار مسلمانوں کو کچلنے کے درپے ہو گئے۔ مسلمانوں کے لئے قعرِ مذلت اور مرگِ دوام کے دروازے کھل گئے۔ ایسے حوصلہ شکن اور ناسازگار ماحول میں سرسید احمد خاں اور اس کے رفقائے کار نے مسلمانوں کو سنبھالا دینے کی منظم کوشش کی اور قوم کی کشتی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نذرِ گرداب ہونے سے بچا لیا۔ عیسائیت اور اسلام میں سمجھوتے کی صورت کو واضح کیا گیا۔ بعض دو طرفہ غلط فہمیاں بے نقاب کی گئیں۔ مسلمانوں کو "چلو تم ادھر کو جدھر کی ہوا ہو" اور "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کا درس دیا گیا اور انگریزوں سے دستِ شفقت کی تمنا کی گئی۔ ان کوششوں

کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرنگی اقتدار کے ساتھ مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات بھی مسلمانوں کی زندگی میں غالب آنے لگے۔ نئی سیاسی، سماجی اور مذہبی اقدار نے جنم لیا۔ مشرقی روحانیت کی جگہ مغربی مادیت نے زور پکڑا۔ سیاست کو مذہب سے الگ سمجھا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ مذہب پر مبنی قومیت کی بجائے مسلمانوں میں بھی دیگر اقوام کی طرح جغرافیائی حدود سے وابستہ قومیت کا تصور مقبول ہونے لگا۔ اردو ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے مغربی ادب کے زیر اثر نئے اصول پیش کیے گئے اور نثر و نظم کے ذخیرہ میں نئے خیالات اور نئے ہیتی تجربات کا اضافہ کیا گیا۔ سر سید حالی شبلی اور ان کے دیگر شرکائے کار کی تحریریں اسی انداز فکر و عمل کی ترجمان ہیں۔ جب رہنمایانِ قوم کے ہاتھوں سے نئی تہذیب کا اس طرح استقبال ہوا تو عام مسلمانوں کی اکثریت کا تہذیبِ نو کی چمک سے مرعوب ہونا یقینی امر تھا لہٰذا مغربی اثرات مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں بڑھنے لگے اور قدیم مذہبی اور تہذیبی اقدار مٹنے لگیں۔ مذہب سے مسلمان بیگانگی برتنے لگے۔ کتابِ فیض کے لیے حجاز کی بجائے لندن کی طرف رخ ہونے لگا۔ قرآن کریم کو بھول کر مغربی مفکرین کے در پر دریوزہ گری ہونے لگی۔ مغربیت کے اس بڑھتے ہوئے طوفان کو دیکھ کر ڈپٹی نذیر احمد اور اکبر الہ آبادی تلملا اٹھے۔ فرنگی اقتدار سے نبرد آزما ہونے کی ہمت نہ تھی۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش کے مصداق ایک نے کہانیوں کے روپ میں اور دوسرے نے مزاح کے پردے میں مسلمانوں کو اندھا دھند مغرب کی تقلید سے منع کیا اور راہِ اعتدال اختیار کرنے تلقین کی۔

قرآن اور اسلام سے مسلمانوں کو بیگانہ دیکھ کر اکبر کو یہ کہنا پڑا :-

عوضِ قرآں کے اب ہے ڈراون کی ذکر ہوتی ہیں
جہاں تھے حضرت آدم وہاں بندر اچھلتے ہیں

توحید ان کے دلوں میں محفوظ نہیں
اللہ کے ذکر سے یہ محظوظ نہیں

اس فرقہ نو کو میں نے دیکھا ایسا — اسلام ان کی نظر میں ملحوظ نہیں

سرسید تو مسلمانوں کو انگریزوں کا ہمخیال و ہمقدم بنانے کی کوشش میں جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے، حالی و شبلی پر بعد از ایام یہ حقیقت فاش ہو گئی کہ مغرب کے نور سے مشرق کا ظلمت کدہ منور نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ دونوں بزرگ بھی اپنی عمر کے آخری ایام میں انگریزوں سے بیزاری کا اظہار کرنے لگے۔ لیکن ان نواہائے در پردہ نیم مردہ کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ انگریزوں کے طلسم کو توڑنے کے لئے ضرب کلیم درکار تھی۔ قدرت نے وقت کی اس ضرورت کو اقبال کی صورت میں پورا کیا۔ جو پیامِ مشرق لایا جس نے بانگِ درا کی صورت میں اہل قافلہ کے لئے بیداری کا سامان فراہم کیا بالِ جبریل سے قوت بخشی اور ارمغانِ حجاز پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ شاعرِ انقلاب نے "با زمانہ بساز" سے گزر کر "با زمانہ ستیز" کا نعرہ لگایا اور صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ روئے زمین کے تمام انسانوں کو حسبِ ضرورت ناخوشگوار ماحول سے برسرِ پیکار ہونے کی ان الفاظ میں دعوت دی:۔

گفتند جہاں ما آیا تو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

تخریب کے بعد تعمیرِ نو کے خدوخال کی نشاندہی ان الفاظ میں فرمائی:

مصطفیٰ کو از تجدد می سرود	گفت نقشِ کہنہ را باید زدود
نو نگردد کعبہ را رختِ حیات	گر ز افرنگ آیدش لات و منات
ترک را آہنگِ نو در چنگ نیست	تازہ اش جز کہنہ افرنگ نیست
سینہ او را دمے دیگر نبود	در ضمیرش عالمے دیگر نبود
لاجرم با عالمِ موجود ساخت	مثلِ موم از سوزِ این عالم گداخت

طرفگیہا در نہاد کائنات نیست | از تقلید تقویم حیات نیست
زندہ دل خلاق اعصار و دہور | جانش از تقلید گردد بے حضور
چوں مسلماناں اگر داری جگر | در ضمیر خویش و در قرآں نگر
صد جہاں تازہ در آیات اوست | عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
یک جہانش عصر حاضر را بس است | گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیات خداست | ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش | می دہد قرآن جہانے دیگرش

یہ اظہار حقیقت صرف شاعرانہ انداز بیان تک ہی محدود نہیں بلکہ مکتوبات ملفوظات اور بیانات میں بھی اشاعت پذیر ہے۔ آل احمد سرور کے نام ایک خط میں یہ عبارت درج ہے "میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانہ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے، جو بنی نوع انسان کے لئے ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے"۔ اسی طرح ایک بار حیات انسانی کے لئے قرآن پاک کو کافی و وافی قرار دیتے ہوئے غلام احمد پرویز سے فرمایا "قرآن فطرت اللہ ہے" یعنی دنیا میں مختلف اوقات میں مختلف حقائق ظاہر ہوئے کوئی یہاں کوئی وہاں۔ ہر حقیقت فطرت اللہ ہوتی ہے۔ ان حقائق کے منتشر اوراق ایک جگہ جمع کر دیئے اس مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ اب بھی جہاں کہیں حقیقت ظاہر ہوگی۔ وہ لینن کے الفاظ میں ہو یا سنوسی کے، قرآن ہی کی کسی آیت کا ترجمہ ہوگا۔ اس لئے کہ حیات انسانی کے لئے جس قدر حقائق کی ضرورت تھی۔ وہ سب کے سب اس کے اندر رکھے ہیں۔"

ڈاکٹر نکلسن کو یہی بات ایک مکتوب میں بدیں الفاظ سمجھائی :-

" قرآن الٰہیات کی کتاب نہیں۔ بلکہ اس میں انسان کی معاش و معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، پوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا تعلق الٰہیات کے ہی مسائل سے ہے۔ عہد جدید کا ایک مسلمان اہل علم جب ان مسائل کو مذہبی تجربات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے جن کا مدار اور سرچشمہ قرآن مجید ہے، تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے "۔

یہ تو صلائے عام کی صورت ہے، جب اس میں تخصیص پیدا ہوتی ہے اور شاعر انقلاب مسلمانوں سے مخاطب ہوتا ہے، تو بیان میں وضاحت اور قطعیت انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ اپنی مختصر مثنوی مسافر میں فرماتے ہیں:

بہرہ را تہ قرآن اگر خواہی ثبات	در ضمیرش دیدہ ام آب حیات
می دہد مارا پیام لاتخف	می رساند بر مقام لاتخف
نقش قرآں تا دریں عالم نشست	نقش ہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است	ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود	جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود
مثل حق پنہاں و ہم پیداست ایں	زندہ و پایندہ و گویاست ایں
نوع انساں را پیام آخریں	حامل او رحمۃ للعالمین
گر تو می خواہی مسلماں زیستن	نیست ممکن جز بقرآں زیستن

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب
تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب

اسی مثنوی میں علامہ اقبال اس بات کا بھی اعلان فرماتے ہیں کہ ان کے نظام فکر کا سب سے بڑا ماخذ قرآن ہے۔ اعلان کے الفاظ یہ ہیں:۔

گوہر دریائے قرآن سفتہ ام | شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام

رموز بے خودی میں یہ اعلان حلفیہ بیان کی صورت اختیار کر لیتا ہے فرماتے ہیں:۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است | ور بحرفم غیر قرآن مضمر است
ای فروغت صبح اعصار و دہور | چشم تو بینندہ ما فی الصدور
پردہ ناموس فکرم چاک کن | ایں خیاباں راز خارم پاک کن
تنگ کن رخت حیات اندر برم | اہل ملت را نگہدار از شرم
خشک گرداں بادہ در انگور من | زہر ریز اندر مئی کافور من
روز محشر خوار و رسوا کن مرا | بے نصیب بوسۂ پا کن مرا
گر در اسرار قرآن سفتہ ام | با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
عرض کن پیش خدائے عز و جل | عشق من گردد ہم آغوش عمل

اُم الکتاب سے شاعر کی عقیدت رسمی اور سرسری نہیں ہے۔ بلکہ ایمان کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ حکیم ملت کو پختہ یقین ہو چکا تھا کہ عصر حاضر میں انسانیت کی نشو و نما کا ضامن صرف قرآن ہے۔ قیام یورپ کے دوران میں وسیع مطالعے، گہرے مشاہدے اور متنوع تجربے نے ان کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب کر دی تھی کہ مغربی تہذیب چھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے اسے ثبات و دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی حیثیت نازک شاخ پر بننے والے ناپائیدار آشیانہ سے زیادہ نہیں، اسی احساس نے برصغیر پاک و ہند کے اس مفکر اعظم کو جسے شراب علم کی لذت وطن کے نگار خانے سے کشاں کشاں مغرب میں لے گئی تھی۔ سر عبد القادر کے نام یہ پیغام بھیجنے پر مجبور کیا۔

مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہدے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

اس میں بھی شک نہیں کہ علامہ کو "یورپ میں رہنے، حکمت فرنگ سے گہرا تعلق پیدا کرنے اور اس کی تہذیب و تمدن کا براہِ راست مشاہدہ کرنے سے طرح طرح کے فائدے پہنچے۔ اقبال کی نظر آغاز ہی سے محققانہ تھی۔ اس لئے اس کی زندگی میں مغرب کی کورانہ تقلید کا کوئی شائبہ پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے یورپ کے سطحی طمطراق کو بھی دیکھا، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کے باطن پر بھی گہری نظر ڈالتا گیا۔ اس نے فرنگ میں علم و ہنر کے کمالات اور انسانی زندگی کی بہبود کے لئے ان کے مفادات کو بھی دیکھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس سے بھی آگاہ ہو گیا کہ اس تعمیر میں ایک خرابی کی صورت بھی مضمر ہے۔ یورپ میں اس نے عقل کی کرشمہ سازیاں بھی دیکھیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو نظر آیا کہ اس علم و فن کی نظر زیادہ تر تن کی طرف ہے، من کی طرف نہیں دماغ کی تربیت ہوتی ہے، مگر دل تشنہ و گرسنہ رہ جاتا ہے۔

افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

مگر یہ فقط جنتِ نگاہ اور فردوس گوش ہے جس کے گرویدہ ہونے کا عبرت انگیز انجام غالب نے بھی آخری عمر میں ایک قطعہ میں بیان کیا تھا۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

اقبال نے دیکھا کہ فرنگ کی ذہنیت مادی مفاد اندوزی میں اس عشق سے بیگانہ ہو گئی ہے، جو انسانی روح کے اندر زندگی کی لامتناہی اقدار کا خلاق اور حقیقی ارتقائے حیات کا ضامن ہے۔ یورپ میں اس کو جو تجلی نظر آئی۔ اس کی مشرقی بصیرت نے اس کے متعلق یہی فتوےٰ دیا کہ:-

ہنگامہ گرم ہستی ناپائیدار کا ۔۔۔ چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا[1]

اس طرح شاعر اسلام نے شریک محفل کی حیثیت سے مغربی تہذیب کے گھناو نے اور انسانیت سوز پہلوؤں کو بھی جب روشن پہلوؤں کے ساتھ دیکھا نیز ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے ایران کے فلسفہ الہیات THESIS لکھنے کے لئے مسلمان مفکرین کی تصانیف کا وسیع مطالعہ کیا، تو ان کی حقیقت بین اور دوررس نگاہوں کے سامنے مغرب کی برتری کا طلسم بالکل ٹوٹ گیا اور وہ مغرب سے مایوس ہو کر مشرق ہی سے روشنی فکر کے طالب ہوئے۔ اس عالم میں قرآن کریم کی حلاوت سے ان کا لگاؤ بڑھا جو آہستہ آہستہ اواخر عمر میں عشق قرآن کی صورت اختیار کر گیا۔ ویسے بھی تلاوت قرآن بچپن ہی سے ان کا محبوب شغل تھا۔ بالفاظ عبد السلام ندوی صبح کے وقت روزانہ قرآن مجید کی تلاوت نہایت پابندی سے کرتے تھے اور ان کے اسی ذوق و شوق کو دیکھ کر ان کے والد نے ان کو یہ نصیحت کی تھی کہ جب تک تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم پر ہی اترا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہمکلام ہے اور ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے واقعات بتاتے ہیں کہ انہوں نے اس نصیحت پر شدت سے عمل کیا[2]۔ مولوی ابو محمد مصلح لکھتے ہیں کہ شاعر اعظم قرآن مجید کی تلاوت کے وقت وجد میں آجاتا تھا۔ اقبال اپنی نظموں کو ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ پھر یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ خدا کے کلام کو سنوار کر نہ پڑھتے۔ قرآن مجید کی تلاوت باواز بلند کرتے تھے جس سے ان کے قلبی جوش کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ حال حال بن جاتا تھا اور شاعر پر ایک خاص عالم طاری ہو جاتا تھا۔ اقبال راتوں میں جاگتے

---

[1] خلیفہ عبد الحکیم ۔۔ فکر اقبال ۔۔ [2] عبد السلام ندوی ۔۔ اقبال کامل

تھے اور سحر خیزی ان کی چہیتی چیز تھی۔ پھر قرآن کو تو ان اوقات کے ساتھ خاص لگاؤ ہے لہٰذا شغف قرآن، قرآن کے نورانی صفحات ان کے سامنے کر دیتا اور یہ بلبل ہزار داستان بڑی خوش الحانی کے ساتھ تلاوت قرآن میں مصروف نظر آتا تھا۔ کہا جا سکتا ہے، اقبال لحیم شحیم تھے۔ مگر رقیق القلب ایسے تھے کہ دوران تلاوت میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ زندگی کے آخری ایام میں جب بیماری کا تسلط بڑھ گیا تو "انہیں غم تھا تو صرف اجتناب صورت کا۔ بچپن ہی سے ان کی عادت تھی کہ قرآن مجید کی تلاوت بلند آواز سے کرتے۔ ظاہر ہے کہ اب یہ فریضہ اس رنگ میں ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا تھا۔ اس کا انہیں بے حد قلق تھا۔"[۱۷]

اس مرحلہ پر اس بات کی وضاحت نامناسب نہیں ہو گی کہ علامہ اقبال کا قرآن سے لگاؤ صرف دوسروں کو اس کی طرف مائل کرنے اور خود تلاوت کرنے تک ہی محدود نہ تھا۔ نیز قرآن کی عظمت کا اعلان بلاوجہ نہ تھا۔ ان کے کلام میں اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ انہوں نے عصر حاضر میں پیدا شدہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لئے قرآن حکیم کا سہارا لیا سرمائے کی ناہموار تقسیم اور سرمایہ دار و مزدور کے مسائل سلجھانے کے لئے کارل مارکس کے بے نظام اشتراکیت کو پسند نہ کیا بلکہ قرآن کی روشنی میں ان مسائل کے متعلق یہ الفاظ اظہارِ خیال کیا :۔

با مسلمان گفت جاں بر کف بنہ ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ

اس شعر میں ظاہر ہے کہ قرآن کی اس آیت کا مفہوم پیش کیا گیا ہے :۔

"و یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو" (اے پیغمبر تجھ سے یہ لوگ سوال کرتے ہیں کہ

۱۷۔ سید نذیر نیازی ــــ رسالہ اردو اقبال نمبر

راہِ خدا میں کتنا خرچ کیا جائے۔ جواب دے اپنی اشد ضروریات زندگی کے علاوہ جو بھی ہے راہِ خدا میں خرچ کر سکتے ہو)

چیست قرآن خواجہ را پیغام مرگ — دستگیر بندہ بے ساز و برگ

کار خلقت کا ہے مالک مرد ک تا کردہ کار — عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اسے ناساز گار

حکم حق ہے لیس للانسان الا ما سعیٰ — کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

قومیت کے جغرافیائی تصور یعنی وطنیت کو باطل قرار دینے کے لئے "پیام مشرق" میں طارق کی زبان سے یہ فرمایا:۔

خندید دوست خویش بہ شمشیر برد و گفت — ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

اس شعر میں اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے:۔

• ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثہا عبادی الصلحون:

ترجمہ:۔ (ہم نے زبور میں نصائح کے بعد یہ چیز (بطور عہد) لکھ دی ہے کہ ہم اپنی زمین کا وارث و حاکم اپنے نیک بندوں کو کریں گے۔)

قرآن کی مختلف آیات کا مفہوم اپنے الفاظ میں قلمبند کرنے کے علاوہ شاعر ملت نے اپنی تلمیحات کا بیشتر حصہ بھی اسی سے حاصل کیا ہے اور اکثر اشعار میں مختلف آیات کی طرف اشارے کئے ہیں بطور مثال چند اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

باش مانند خلیل اللہ مست — ہر کہن بتخانہ را باید شکست

یوسف ما را اگر گرگے برد — بہ کہ مردے ناکسے او را خرد

از شریعت "احسن التقویم" شو — وارث ایمان ابراہیم شو!

مرد حر محکم ز ورد "لاتخف" — ما بمیدان سر بجیب او سر بکف

"علم اسما" اعتبار آدم است — حکمت اشیا حصار آدم است

در میان امت آں کیوان جناب — ہمچو حرف "قل ہو اللہ" در کتاب

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا — شرح "انی جاعل" سازد ترا

تو معنیٔ "والنجم" نہ سمجھا تو عجب کیا — ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے "قم باذن اللہ" — وہی زمیں وہی گردوں ہے "قم باذن اللہ"

جو حرف "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک — اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیہ "ان الملوک" — سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

عطا اسلاف کا جذب دروں کر — شریک زمرۂ "لا یحزنون" کر

تلمیحات بعض اور شاعروں کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن آیات و مشہور اقوال کا بجنسہ شعر میں کھپا دینا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ قرآن مجید نظم میں نہیں بلکہ نثر میں ہے۔ لیکن اس کی بعض آیات یا آیات کے بعض ٹکڑے ایسے ہیں کہ شاعری کے معیار اوزان پر پورے اترتے ہیں۔ ایسے ٹکڑے وہی شخص تلاش کر کے شعروں میں لا سکتا ہے جس نے قرآن کا مطالعہ غور سے کیا ہو۔

مولانا روم کا سارا کلام ایسی تلمیحات سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں وہ شعروں میں آیات لاتے ہیں اور کہیں آیات کا ترجمہ و مفہوم بیان کرتے ہیں۔ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام "ہست قرآن در زبان پہلوی" کا صحیح مصداق ہے۔ ڈاکٹر اقبال چونکہ ان کو تصوف میں امام ملتے ہیں۔ اس لئے تصوف کے اشعار میں انہیں کا تتبع کیا ہے اور اقبال کی مثنوی میں وہی رومی کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔[1]

اس موقعہ پر ذہن میں دو سوال ابھرتے ہیں پہلا یہ کہ شاعر قرآن کو عربی زبان پر کس قدر قدرت حاصل تھی۔ دوسرا یہ کہ ان کی رسائی مطالب قرآن تک بواسطہ تھی یا بلا واسطہ پہلے سوال کا جواب ان کے مکتوبات میں نہایت واضح الفاظ

فضل الٰہی عارف ـــ تلمیحات اقبال

میں موجود ہے۔ مہاراجہ سرکشن بہادر شاد وزیر اعظم ریاست حیدر آباد دکن کے نام ایک مکتوب میں فرماتے ہیں "عربی زبان کے امتحانات میں میں اوّل رہا ہوں" پھر پروفیسر شجاع منعمی کے نام ایک خط میں اپنے عربی داں ہونے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"کوئی آدمی عربی زبان کے چارم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں نے طالبعلمی کے زمانے میں خاصی عربی سیکھ لی تھی۔ مگر بعد میں اور مشاغل کی وجہ سے اس کا مطالعہ چھوٹ گیا۔ تاہم مجھے اس زبان کی عظمت کا صحیح اندازہ ہے۔" خاصی عربی سیکھ لینے کا اگر ہم عملی صورت میں ثبوت چاہیں، تو علامہ کی نگارشات میں وہ بھی مل جاتا ہے۔ ان کے فارسی اور اردو کلام میں قرآنی آیات کے مختلف صورتوں میں جو اشارات موجود ہیں، ان کے علاوہ مکتوبات اور مطبوعہ بیانات و مضامین میں ایسے مباحث شامل ہیں، جو ان کی . . . عربی زبان میں غیر معمولی دسترس کی واضح دلیل ہیں۔ سراج الدین پال کے نام ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:" صیام کے متعلق آپ کا مضمون نہایت عمدہ ہے اور میرے مذہب کے عین مطابق، بلکہ آپ کے مضمون کا آخری فقرہ میں نے سب سے پہلے پڑھا۔ یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔ یطیقونہ میں تمام بوڑھے، فطری کمزور اور حائضہ عورتیں شامل ہیں۔ ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معنی لئے جاتے ہیں، جو عربی زبان میں ہرگز نہیں ہیں۔" اس خط کے علاوہ اس بات کا بھی سراغ ملتا ہے کہ وہ جدید عربی تصانیف کا مطالعہ بھی کیا کرتے تھے اور عربی زبان میں شائع ہونے والے مذہبی اور عربی جرائد بھی پڑھا کرتے تھے۔

سید سلیمان ندوی کے نام لکھے گئے خطوط جو "اقبال نامہ" میں شائع ہو چکے ہیں اس سلسلہ کی اہم کڑی ہیں۔ بیانات و مضامین میں سے ان کا وہ بیان خواندنی و شنیدنی ہے، جو انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ایک کثیر گروہ کے رہنما مولانا حسین احمد مدنی کے بیان کے جواب میں روزنامہ "احسان" لاہور میں ۹ مارچ ۱۹۱۸ء کو شائع کیا تھا۔ اس صحافتی معرکہ کا آغاز یوں ہوا کہ ڈاکٹر اقبال نے وطنیت کے سیاسی تصور کی مذمت کرتے ہوئے ایک بار مولانا حسین احمد کے متعلق جو وطنیت کے سیاسی تصور کے حق میں تھے یہ شعر لکھ دیا:-

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است   چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

اس شعر کے جواب میں مولانا موصوف نے ایک بیان شائع فرمایا اور اس میں ڈاکٹر موصوف کی عربی زبان سے لاعلمی پر طنز کیا۔ اس بیان کے جواب میں ڈاکٹر اقبال نے جو بیان شائع فرمایا۔ اس کی چند سطور ملاحظہ کیجئے:- "مولانا (یعنی حسین احمد مدنی) نے یہ فرض کر کے کہ مجھے قوم اور ملت کے معانی میں فرق معلوم نہیں اور شعر لکھنے سے پہلے جہاں میں نے مولانا کی تقریر کی اخباری رپورٹ کی تحقیق نہ کی۔ وہاں قاموس کی ورق گردانی بھی نہ کر سکا۔ مجھے عربی زبان سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ یہ طعنہ سر آنکھوں پر لیکن کیا اچھا ہوتا اگر میری خاطر نہیں تو عامۃ المسلمین کی خاطر قاموس سے گذر کر قرآن حکیم کی طرف مولانا رجوع کر لیتے اور اس خطرناک اور غیر اسلامی نظریئے کو مسلمانوں کے سامنے رکھنے سے پیشتر خدائے پاک کی نازل کردہ مقدس وحی سے بھی استشہاد فرماتے مجھے تسلیم ہے کہ میں عالم دین نہیں نہ عربی زبان کا ادیب:-

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا   فقیہہ شہر قارون ہے لغت ہائے حجازی کا

لیکن آپ کو کونسی چیز مانع آئی کہ آپ نے صرف قاموس پر اکتفا کی۔ کیا

قرآنِ پاک میں سینکڑوں جگہ لفظ قوم استعمال نہیں ہوا۔ کیا قرآن میں ملت کا لفظ متعدد بار نہیں آیا! اس کے بعد علامہ نے ملت اور قوم کا مفہوم قرآن کی رو سے واضح کیا اور اپنے موقف کی تائید کی۔ ان حقائق کے علاوہ یہ حقیقت بھی کہ اندلن میں اپنے استاد ڈاکٹر آرنلڈ کی جگہ چھ مہینے تک انہوں نے عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔" ان کی عربی زبان سے گہری واقفیت کی روشن مثال ہے۔

دوسرے سوال کا جواب داخلی اور خارجی شہادتوں سے یہ ملتا ہے کہ علامہ نے مطالب قرآن تک بالواسطہ اور بلا واسطہ دونوں صورتوں میں رسائی حاصل کی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔ کہ ۱۹۰۵ء تک ایک عام مسلمان مذہبی گھرانے کے فرد کی طرح اقبال کا تعلق قرآن کے ساتھ صرف تلاوت تک محدود رہا۔ اس دور کے کلام میں قرآنی مطالب کو پیش کرنے کی کوشش کرتے وہ کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ جہاں تک قرآنی تلمیحات استعمال کرنے کا تعلق ہے، انہوں نے اس دور میں مندرجہ ذیل قرآنی تلمیحات ایک ایک دو، دو یا تین تین بار استعمال کی ہیں۔ کلیم طور۔ قُم۔ تسخیر۔ کن۔ والشمس والنور۔ یوسف آدم، نوح، لا الا اللہ حین اشعار میں یہ تلمیحات استعمال کی گئی ہیں۔ ان کے سرسری مطالعہ سے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ محولہ بالا تلمیحات اس دور میں صرف اقبال کے شاعرانہ انداز بیان کا جزو ہیں اور حکیمانہ نظام فکر کا جزو نہیں ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

غنچہ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے | سر پہ سبزے کے کھڑے ہوکے کہا قم میں نے
(ابر کوہسار)

اندھیرے میں اڑایا تاجِ زرِ شمع شبستان کا | طلسمِ ظلمتِ شب سورۂ والنور سے توڑا
(پیامِ صبح)

۱۹۰۵ء تک کے اشعار میں لفظ قرآن بھی انہوں نے صرف ایک بار اس شعر میں استعمال کیا ہے:

زمین کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے — غضب ہے سطر قرآن کو چلیپا کر دیا تو نے

یہ شعر ان کی نظم "تصویرِ درد" میں موجود ہے جو قومیت کے سیاسی تصور کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ۱۹۰۵ء تک انہوں نے صرف بلال اور التجائے مسافر دو ایسی نظمیں لکھی ہیں جن کا ماحول اسلامی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ان نظموں میں بھی قرآن سے ان کے والہانہ فکری لگاؤ کا اظہار نہیں ہوا ہے۔

۱۹۰۵ء میں جب انگلستان پہنچے، تو انہیں مطالب قرآن سے گہری آشنائی کی ضرورت پیش آئی۔ ضرورت دو طرح کی تھی، پہلی یہ کہ فلسفہ ایران پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھنے کے لیے مسلمان، ایرانی مفکرین اور شعرا کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہوئے افکار قرآن اور تلمیحات قرآن سے واقفیت ضروری تھی کیونکہ مسلمان مفکرین اور شعرا نے مطالب و تلمیحات قرآن کو اپنی تصانیف میں بکثرت پیش کیا تھا۔ ضرورت کی دوسری صورت ممکن ہے یہ رہی ہو اور آرنلڈ کی جگہ عربی پڑھاتے ہوئے عربی زبان اور مطالب قرآن سے غیر معمولی واقفیت حاصل کرنا پڑی ہو۔ اس سلسلہ میں علامہ کا ایک خط بہت اہم ہے۔ کیونکہ وہ اسی دور سے متعلق ہے اور اس میں افکارِ قرآن سے آشنا ہونے کی کوشش نمایاں ہے۔ نیز اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اس دور میں دوسروں کی وساطت سے مطالب قرآن تک پہنچے۔ محولہ بالا خط خواجہ حسن نظامی کے نام ۱۹۰۵ء میں لکھا گیا۔ خط کی متعلقہ سطور ملاحظہ کیجیے۔ "اب ایک اور تکلیف دیتا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں۔ ان کا پتہ دیجیے۔ سپارہ اور رکوع کا پتہ لکھیے اس پارہ میں

آپ قاری شاہ سلیمان صاحب یا کسی اور صاحب سے مشورہ کر کے مجھے بہت جلد مفصل جواب دیں۔ اس مضمون کی سخت ضرورت اور یہ گویا آپ کا کام ہے قاری شاہ سلیمان صاحب کی خدمت میں میرا یہی خط بھیج دیجئے اور بعد التماس دعا عرض کیجئے کہ میرے لئے یہ زحمت گوارا کریں اور مہربانی کر کے مطلوبہ قرآنی آیات کا پتہ دیویں۔

اگر قاری صاحب موصوف کو یہ ثابت کرنا ہو کہ مسئلہ وحدۃ الوجود یعنی تصوف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکلتا ہے تو وہ کون کون سی آیات پیش کر سکتے ہیں اور ان کی کیا تفسیر کرتے ہیں۔ کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تاریخی طور پر اسلام کو تصوف سے تعلق ہے۔ کیا حضرت علی مرتضےٰ کو کوئی خاص تعلیم دی گئی تھی! غرضیکہ اس امر کا جواب معقولی اور منقولی اور تاریخی طور پر مفصل چاہتا ہوں۔" اس خط کے پیش نظر یہ کہنا نامناسب نہیں ہو گا کہ ۱۹۰۵ء سے ڈاکٹر اقبال نے اپنے افکار کے لئے قرآن کریم کو ماخذ بنایا اور مذہبی علما اور فارسی تصانیف کے سہارے مطالب قرآن سے آگاہ ہونے کے لئے کوشش کرنے لگے۔ مذہبی علما میں سے خواجہ حسن نظامی اور سید سلیمان ندوی قابل ذکر ہیں اور فارسی تصانیف میں سے فلسفہ اور اخلاق کی فارسی کتب بالعموم اور رومی، سعدی، حافظ، سنائی، عطار اور محمود شبستری کی کتب شعر... خصوصیت کی حامل ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم علامہ کے کلام کا مجموعی صورت میں جائزہ لینے کے بعد چند نتائج تک پہنچتے ہیں۔ ان میں سے پہلا یہ ہے کہ انھوں نے قرآنی افکار اور تلمیحات کو بیشتر صورتوں میں مذکورہ بالا شعرا کے کلام سے اخذ کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ ان کے فارسی کلام کے مقابلہ میں اردو کلام میں قرآنی تلمیحات اور افکار

بہت کم ہیں۔ تیسرا یہ کہ وہ بتدریج ابہام وسائل کو چھوڑ کر بلا واسطہ غیرے خود قرآنی تصورات معلوم کرنے لگے اور جدید سیاسی اور معاشی مسائل کا حل قرآنی افکار میں ڈھونڈنے لگے یہ رجحان ۱۹۱۴ء سے بہت نمایاں ہوگیا۔ اس سال اسرار خودی لکھتے ہوئے انہوں نے واضح صورت میں قرآنی نظام حیات اپنانے کی مسلمانوں کو تلقین کی۔ اس دور میں قرآنی تلمیحات بھی انہوں نے بکثرت استعمال کیں اور انہیں اپنے نظام فکر کا جزو بنا دیا۔ قرآن سے یہ لگاؤ زندگی کے آخری سالوں میں اتنا بڑھ گیا کہ وہ عاشق قرآن بن گئے۔ اس دور میں انہوں نے خود قرآن سے متعلق ایک تصنیف پیش کرنے کا ارادہ بھی کیا۔ جو پورا نہ ہو سکا۔ سید راس مسعود کو ۱۹۳۵ء میں لکھتے ہیں۔ "میرے لئے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا، جو عرصہ سے میرے زیر غور ہیں۔ لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکیگا اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیش کش مسلمانان عالم کو نہیں کر سکتا۔" چوتھا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں فارسی شاعری کے مقابلہ میں عربی شاعری اور ادب کے اثرات نہ ہونے کے برابر ملتے ہیں۔ اس بات کو بعض لوگوں نے علامہ کے عربی زبان سے ناآشنا ہونے کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ جو گذشتہ مباحث کے پیش نظر درست نہیں ہے اصل وجہ یہ ہے کہ وہ فلسفہ ایران کا مطالعہ کرتے ہوئے رومی کی قیادت میں اسلامی نظام فکر یا قرآن تک پہنچے اور اس منزل پر پہنچ کر وہ پھر قرآن ہی کے ہو کر رہ گئے علاوہ ہریں چونکہ فارسی زبان کو بھی ذریعہ اظہار خیال بنا لیا اس لئے فارسی ادب کے اثرات ان کے کلام میں نمایاں ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ

علامہ کی تحریروں کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربی زبان کے مقابلہ میں ان کو فارسی زبان پر زیادہ قدرت حاصل تھی اور اُس کے ادب کا مطالعہ انہوں نے زیادہ کیا تھا اور یہ ایک فطری امر تھا کیونکہ اس کے ذمہ دار دیگر عوامل کے علاوہ ہندوستان اور ایران کے لسانی اور ادبی روابط بھی تھے۔

گذشتہ سطور میں علامہ کی قرآن دوستی کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ ان کا مسلمانوں پر غیر معمولی اثر ہوا۔ قوم کے نوجوان کو مذہب سے چڑھ ہو چکی تھی اور مذہب پرست طبقہ ان کے کھلے ہوئے الحاد اور دہریت کی وجہ سے ان کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ حضرت علامہ نے دین کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ اس کی روح پھر سے ان کے خون کے ذروں میں جذب ہو گئی اور اسی طرح وہ غیر محسوس طور پر قرآن کریم کے قریب لا کھڑے کر دیئے گئے ہیں[۱۷]۔ ۔ ۔ مسلمانوں کی مذہب میں دلچسپی بڑھی اور سیاست اور مذہب کی جدائی کا زمانہ ختم ہو گیا۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے مذہب کی بنا پر اپنے آپ کو منظم کیا اور پاکستان کے قیام میں کامیاب ہوئے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ نے ناسازگار ماحول میں قرآنی افکار کو مقبول عام بنانے میں ایسی خدمات جلیلہ سرانجام دیں کہ جنہیں مسلمانانِ عالم کی تاریخ سراہے بغیر نہیں رہ سکتی۔

☆

---

۱۷ غلام احمد پرویز ـــــ اقبال اور قرآن

ساقی نامہ

(علامہ اقبال کی ایک بے مثل طویل اُردو نظم کا جائزہ)

علامہ اقبال کا جو کلام اب تک زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے اس کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے عاشقانِ بادہ سخر کے لئے دو قابلِ قدر ساقی نامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ ایک ساقی نامہ بزبانِ فارسی پیامِ مشرق شامل ہے اور دوسرا اُردو زبان میں بالِ جبریل کا جزو ہے، ہمارے پیشِ نظر اگرچہ موخرالذکر ساقی نامہ ہے لیکن موضوع کی مطابقت اور تقابلی و متوازی مطالعہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اوّل الذکر ساقی نامہ کا بھی اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ پہلا ساقی نامہ نشاط باغ کشمیر کی دلکشا فضا میں لکھا گیا ہے۔ اس ساقی نامے میں صرف بیس شعر ہیں اور یہ ہیئت کے اعتبار سے ایک غزل نما نظم ہے۔ پہلے دس شعروں میں شاعر نے نشاط باغ کے حسن و جمال کا جلوہ دکھایا ہے اور کشمیر کے خطۂ بے نظیر کو بدیں الفاظ فردوس زمیں قرار دیا ہے:۔

تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را | نہاد است در دامنِ کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را | رہا سازد از محنتِ انتظارے
چہ خواہم دریں گلستاں گر نہ خواہم | شرابے، کتابے، ربابے نگارے

پہلا حصہ مضامین و مطالب کے اعتبار سے فارسی کے کلاسیکی ساقی ناموں کا

ایک کامیاب اور خوبصورت نمونہ ہے۔ فارسی میں نظامی اور ظہوری کے جواب ساقی ناموں کا بھی نمایاں رنگ ہے۔ گیارہواں شعر گریزیہ کا ہے۔ اس میں علامہ جمال کی ساحرانہ فضا سے نکل کر فکر کی پرسوز اور پر نور وادی میں قدم رکھتے ہیں اور اپنی نظم کو مناظر فطرت کی عکاس ہونے کے علاوہ اپنے گراں مایہ افکار کا ترجمان بناتے ہیں۔ ان کو اپنے آبا و اجداد کے وطن کشمیر سے جو والہانہ محبت اور مسائل کشمیر میں جو غیر معمولی دلچسپی تھی، نظم کے دوسرے حصے کا ایک ایک لفظ اس محبت اور دلچسپی کا آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں:-

سرت گردم اے ساقی ماہ سیما — بیار از نیاگانِ ما یادگارے
بہ ساغر فرو ریز آبے جاں را — فروزد چو نورے بسوزد چو نارے
نہ بینی کہ از کاشغر تا بہ کاشان — ہماں یک نوا بالد از ہر دیارے
ز چشم امم ریخت آں اشک نابے — کہ تاثیر او گل دماند ز خارے
کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ — بتے می تراشد ز سنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بلندے — خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او — نصیب تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے — نہ در سینۂ او دل بے قرارے

از آں مے فشاں قطرہ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

تاریخی اعتبار سے اولیت کا سہرا اسی فارسی ساقی نامہ کے سر ہے۔ کیونکہ "پیام مشرق" کا سال طباعت ۱۹۲۳ء ہے اور "بال جبریل" کا سن اشاعت ۱۹۳۵ء ہے۔ بال جبریل سے پہلے علامہ اپنا اردو کا پہلا مجموعہ کلام "بانگ درا" ۱۹۲۴ء میں شائع کر چکے تھے۔ ہمارا موضوع علامہ کا اردو میں ساقی نامہ ہے۔ جو

فارسی میں لکھے گئے ساقی نامہ کے بعد ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک کے زمانہ میں کسی وقت لکھا گیا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ علامہ نے "بالِ جبریل" میں شامل نظموں کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا تھا، تو پھر یہ قرین قیاس ہے کہ ساقی نامہ ۱۹۳۱ء کے بعد لکھا گیا ہوگا کیونکہ "بالِ جبریل" میں ساقی نامہ سے پہلے علامہ کی مشہور و معروف نظم مسجد قرطبہ موجود ہے جس کے متعلق مسلم ہے کہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں علامہ کے سفر یورپ کے دوران لکھی گئی تھی۔ "بالِ جبریل" سے قبل علامہ اُردو کے مجموعہ کلام "بانگِ درا" کے علاوہ فارسی زبان میں "اسرارِ خودی" ۱۹۱۴ء میں "رموزِ بیخودی" ۱۹۱۵ء میں "پیامِ مشرق" ۱۹۲۲ء میں "زبورِ عجم" ۱۹۲۷ء میں "جاوید نامہ" ۱۹۳۲ء میں اور "مسافر" ۱۹۳۲ء میں شائع کر کے فارسی دان طبقہ کے دل و دماغ پر قابض ہو چکے تھے۔ "اسرار و رموز" کو اندرون ملک اور بیرون ملک غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی پروفیسر نکلسن نے "اسرار" کو انگریزی کا لباس پہنا کر مغرب میں اقبال کے تصورِ خودی کا شہرہ عام کیا اور اس طرح شاعرِ مشرق صرف مشرق میں ہی نہیں بلکہ مغرب میں بھی شاعر کے علاوہ بحیثیت مفکر مشہور ہوا۔ فارسی زبان کو ذریعہ اظہار افکار بنانے پر دلدادگانِ شاہدِ اُردو اور عاشقانِ افکار نے دبی زبان سے احتجاج کیا اور علامہ کو ان کا اپنا یہ شعر یاد دلایا۔

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے　　شمع یہ سودائی دلسوزیِ پروانہ ہے

اس مخلصانہ احتجاج اور حسنِ طلب کا نتیجہ یہ نکلا کہ سر عبد القادر نے "بانگِ درا" کا دیباچہ لکھتے ہوئے، اقبال سے جس توقع کا اظہار کیا تھا۔ وہ پوری ہو گئی اور ۱۹۳۵ء میں اُردو شاعری کے افق پر "بالِ جبریل" کا طلوع ہوا۔ جس میں علامہ نے وہ تمام افکار نہایت اختصار کے ساتھ دلکش انداز

میں بیان کر دیئے ہیں، جو انہوں نے اپنی فارسی تصانیف میں پیش کئے ہیں
بالِ جبریل اور دوسری متعلقہ کتب کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ حقیقت
پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ مجولہ تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد تاثر کی
فضا میں قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے فارسی تصانیف انگوروں کے
مختلف خوشے ہیں اور بالِ جبریل ایک ایسی مینا ہے، جس میں ان تمام خوشوں سے
کشید کی گئی ایسی شراب بند ہے جو زود اثر ہے اور جس کی تاثیر لازوال ہے۔
بالِ جبریل علامہ کی جملہ اُردو تصانیف میں بھی سرفہرست ہے، بانگِ درا
جو اس سے قبل شائع ہوئی تھی اور ضربِ کلیم، اور ارمغانِ حجاز، (حصہ اردو)
جو اس کے بعد اشاعت پذیر ہوئیں، فنی محاسن اور افکار کی عظمت کے اعتبار
سے بالِ جبریل، کی ہم پلہ تصانیف نہیں ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ
بانگِ درا، میں علامہ کا ان کی شاعری کے ابتدائی دور سے ۱۹۲۴ء تک
کا کلام شامل ہے اور یہ دور وہ ہے جس میں شاعر ابھی ارتقائی منازل طے کر
رہا تھا۔ افکار اور فن میں پختگی بدرجہ کمال نہیں پہنچی تھی۔ ضربِ کلیم، جیسا کہ
نام سے ظاہر ہے، ایک ایسی تصنیف ہے، جس میں افکار کی تلوار بے نیام ہے
جلال کا غلبہ ہے اور جمال کا پہلو دبا ہوا ہے۔ اس تصنیف میں علامہ شاعر کم
اور مفکر زیادہ ہیں۔ ارمغانِ حجاز، کا صرف ایک حصہ اُردو میں ہے اور وہ
بھی صرف ایک ہی رنگ کے فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ نہ تو اس کے مضامین میں
تنوع ہے اور نہ ہیئت کے اعتبار سے ہی رنگارنگی ہے۔ ان تصانیف کے برعکس
" بالِ جبریل، میں فن اور فکر کا صحیح اور حسین امتزاج موجود ہے۔ جلال و جمال
دونوں پہلو اس طرح سموئے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کے لئے ان کی جداگانہ
نشاندہی مشکل ہو جاتی ہے۔ ایک طرف اگر فکر کی عظمت دامنِ دل کھینچتی

ہے، تو دوسری طرف اسلوب کا حسن جاذبِ توجہ ہوتا ہے۔ حکمت کے مسائل، "بالِ جبریل" میں فلسفہ کے خشک مسائل نہیں ہیں، بلکہ سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے دل میں اتر نے والے اشعار ہیں۔ یوں تو ہم "بالِ جبریل" میں شامل تمام اشعار کے متعلق ہی یہ تاثر قائم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں :-

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ! کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

لیکن اس مجموعے میں بالخصوص وہ نظمیں ایسی ہیں، جن کے مطالعہ سے محض تاثر صرف قائم ہی نہیں ہوتا، بلکہ نہایت شدید اور گہرا ہوتا ہے۔ مثاراً علیہ نظمیں مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ ہیں۔ یہ دونوں نظمیں علامہ کے کمال فن کا بین ثبوت اور ان کے حکیمانہ افکار کی روشن دلیل ہیں۔ ان دونوں نظموں کو بلا خوفِ تردید علامہ کی اردو شاعری کا حاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ نظمیں علامہ کے تمام بنیادی افکار کی حامل ہونے کے علاوہ فنی اعتبار سے بھی شاہکار ہیں جتنے موثر، دلکش اور سادہ انداز میں دانائے راز نے ان نظموں میں فرد اور قوم کی حیات و موت کے اسرار بیان کئے ہیں۔ کسی دوسری اردو نظم میں ابلاغ کی وہ اکمل و احسن صورت موجود نہیں ہے۔ یہ نظمیں کہتے ہوئے علامہ جہاں تلمیذ الرحمٰن کے منصب جلیل پر فائز نظر آتے ہیں اور ان کی شاعری کے "جز و یست از پیغمبری" کہلانے کی مستحق دکھائی دیتی ہے وہاں وہ بلاشبہ ایک اعلیٰ درجہ کے فنکار بھی ہیں اور ان کی شاعری مرصع سازی سے کم نہیں ہے۔ علامہ نے مسجد قرطبہ میں فنون لطیفہ میں سے فن تعمیر کو پس منظر بنا کر اپنا تصورِ زماں، تصورِ عشق اور تصورِ مومن پیش کیا ہے، اور ساقی نامہ میں اسلامی تاریخ معاشرت اور سیاست کا سہارا لے کر تصوف، زندگی اور

خودی کے متعلق اپنے نظریات کا اظہار فرمایا ہے۔ اس وقت ان جلیل و جمیل لفظوں میں سے معلوم ہوتا ہے کہ ساقی نامہ لکھنے کی روایت اُردو ادب میں بہت پرانی ہے اور فارسی شاعری میں منتقل ہوئی ہے۔ فارسی اور اردو میں جو ساقی نامے لکھے گئے ہیں، ان کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ ساقی نامے کے لئے کوئی ہیئت مقرر نہیں ہے۔ اساتذہ نے ساقی ناموں کے رنگ میں مثنویوں، قصیدوں، مرثیوں اور غزل میں شعر کہنے کے علاوہ جداگانہ حیثیت کے جو ساقی نامے لکھے ہیں، ان میں مختلف اصنافِ سخن کی ہیئت کو اپنایا ہے۔ ساقی نامہ میں آمدِ فصلِ بہار یا کسی دوسری تقریب سعید کا حسین سہارا لے کر شاعر ساقی سے آبِ نشاط انگیز کا طالب ہوتا ہے۔ تاکہ مسرت و شادمانی، جوش و خروش اور قوت و حرکت سے ہمکنار ہو سکے۔ پژمردگی ختم ہو اور اس کی رگوں میں خون دوڑنے لگے۔ بالفاظ دیگر ساقی نامہ میں آبِ نشاط دراصل آبِ حیات سے عبارت ہے۔ خواہ مجاز کے پردے میں ہو اور خواہ حقیقت کے رنگ میں۔ بطورِ امثال میر تقی میر اور مرزا دبیر کے ساقی ناموں میں سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔ اپنے ساقی نامہ میں لکھتے ہیں :۔

ساقی جو کروں میں بے ادائی | معذور رکھ اب بہار آئی

ساقی قدح کہ ذوق دل ہے | مطرب غزلے کہ فصل گل ہے

ہو صرف شراب کاش ساقی | یہ شیشۂ عمر ہے جو باقی

ساقی وہ شراب شعلہ پرور | کھینچوں میں کہاں تلک دم سرد

وہ دار دے درد بے تھوڑاں   وہ مایہ نورِ چشم کوراں

وہ جس سے غبارِ دل سے دھوؤں   مینا کے گلے سے لگ کے روؤں
مستی کی مجھے خواہشیں ہیں   اس عقل سے دل کو کاہشیں ہیں
لا اس کو جو آستیں جھاڑ دوں   پھر ہاتھ چلے تو جیب پھاڑوں
بے ہوش شرابِ ناب رہیئے   یوں تا بہ کجا کباب رہیئے
ہے مستی بے خودی ضروری   کھل جائے مقامِ بے شعوری

اور مرزا دبیر ساقی سے کہتے ہیں:۔

کہاں کھڑا ہے پسِ خم چھپا ہوا ساقی   ہمارے ساقی ہوش کے آگے ساقی
سبو کی خیر دے اک جام مجھ کو کیا ساقی   یہاں تو لٹتے ہیں خم تو بھی ہے نرا ساقی
حدیثِ شوق چھڑے ذکرِ وصلِ حور چلے
پیالہ ساقی کوثر سے طہور چلے

کھلے یہ حوروں کی زلفوں سے لڑکے موجِ سرور   بہشت میں ہے جو سرچشمہ شرابِ طہور
لیا لیے اس میں سے لاکر پلا دے ساغرِ نور   کہ ہو مذاقِ طبیعت سے غم کی تلچھٹ دور
بہکنے میں بھی جو کچھ دل میں ہو وہی نکلے
جو لڑکھڑا کے گروں منہ سے یا علیؑ نکلے

جس طرح میر اور دبیر نے اپنے ساقی ناموں میں غم ربائی اور حصولِ مسرت کی کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح بہ ادنیٰ تغیر فارسی اور اردو کے دوسرے ساقی نامے لکھنے والے شعراء نے اظہارِ خیال کیا ہے۔

علامہ اقبال نے زیرِ نظر ساقی نامہ میں روایت کو بھی اپنایا ہے اور جدت سے بھی کام لیا ہے۔ ساقی نامہ کا ابتدائی بند کلاسیکی ساقی ناموں کی

طرزبیں ہے۔ اس بند میں آمدِ بہار کا نقشہ بڑے دلفریب انداز میں کھینچا گیا ہے اور عروسِ فطرت کا جلوہ اس طرح دکھایا گیا ہے کہ رعنائی و زیبائی کے ساتھ قوت و حرکت کے اوصاف بھی نمایاں ہو گئے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

۱	ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار	ارم بن گیا دامنِ کوہسار!
۲	گل و نرگس و سوسن و نسترن	شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
۳	جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں	لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
۴	فضا نیلی نیلی ہوائیں سرور	ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
۵	وہ جوئے کہستان اچکتی ہوئی	اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
۶	اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی	بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
۷	رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ	پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

لالہ علامہ کے کلام میں چونکہ صرف ایک پھول کا نام نہیں ہے، بلکہ ملتِ اسلامیہ کے لئے علامت ہے۔ اس لئے وہ خونیں کفن اور شہیدِ ازل ہے۔ یہ بند فنی محاسن کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے الفاظ اور خیالات کی ہم آہنگی بدرجہ کمال ہے ترنم اور نغمہ ہر مصرعے میں نمایاں ہے۔ پہلے شعر میں "ن" اور "ر" کی تکرار سے ایسی صوتی فضا پیدا کی گئی ہے کہ جس سے کارواں کا خیمہ زن ہونا واضح ہے۔ تیسرے شعر میں "گ" اور "ر" کی تکرار سے شاعر کے شدید جذبے کا اظہار ہوا ہے۔ پانچویں اور چھٹے شعر کے الفاظ نے قوت و حرکت کی ترجمانی کے علاوہ نغمے اور ترنم کی ساحرانہ کیفیات پیدا کی ہیں۔ روانی، زوربیان، سلاست اور بے ساختہ پن چند ایسی نمایاں صفات ہیں، جو صرف ان اشعار میں ہی نہیں، بلکہ ساقی نامہ کے تمام اشعار میں موجود ہیں۔ شاعر حیات کو جوئے کوہسار رواں دواں رہنے کی وجہ سے عزیز ہے۔ اس سے وہ زندگی کا پیغام سنتے ہیں اور اس

کی بدولت اپنی طویل نظم میں گریز کی کٹھن منزل سے بڑی کامیابی کے ساتھ یہ کہہ کر گذر جاتے ہیں:۔

ذرا دیکھ اے ساقی لالہ فام سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلا دے مجھے وہ مے پردہ سوز کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز

ساقی کی طرف رجوع کرنے کے بعد علامہ کا راہوار فکر جدت و ندرت کی راہ پر چل نکلتا ہے۔ وہ "چیب پھاڑنے" کی طرف مائل کرنے والی یا "بہکنے" کی کیفیت پیدا کرنے والی شراب ساقی سے طلب نہیں کرتے، بلکہ اپنے مخصوص نظریہ حیات کے مطابق ایسی جوش انگیز اور ولولہ پرور شراب کا تقاضا کرتے ہیں جو حیات آفریں اور قوت بخش ہے جس کے زیر اثر کار زار ہستی میں ایک کمزور طاقتور کے مقابلہ میں نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

پلا دے مجھے وہ مے پردہ سوز کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز
وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات وہ مے جس سے ہے مستی کائنات
وہ مے جس سے ہے سوز و سازِ ازل وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

ممولہ اور شہباز یہاں صرف پرندوں کے نام نہیں ہیں، بلکہ محکوم و حاکم غلام و آقا اور مزدور و سرمایہ دار کے لئے بطور علامات استعمال کئے گئے ہیں علامہ کی اس دعوت انقلاب کو بعض نکتہ چینوں نے امن کی آڑ لے کر ہدف ملامت بھی بنایا ہے اور یہ کہا ہے کہ علامہ ستیزہ کار رہنے کی دعوت دیتے ہیں جو انسانیت کش عمل ہے۔ اس قسم کے اعتراضات دراصل علامہ کے کلام کے سرسری مطالعہ کی پیداوار ہیں اور غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔ علامہ کے کلام کا

بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ وہ صرف مظلوم کو ظالم کے خلاف ابھارتے ہیں اور کمزور کو انتا طاقتور دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں کہ دوسری قوت کو کمزور پر حملہ آور ہونے کی ہمت نہ پڑے۔ وہ بلا وجہ جنگجوئی کی دعوت نہیں دیتے۔ اس حقیقت کا اظہار وہ مولوی ظفر احمد صدیقی کے نام ایک خط میں بدیں الفاظ کرتے ہیں :۔

> " معترض کا یہ کہنا کہ اقبال اس دور ترقی میں جنگ کا حامی ہے غلط ہے
> میں جنگ کا حامی نہیں ہوں۔ نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدود معینہ
> کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے قرآن کی تعلیم کی رو سے جہاد
> یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ "

علامہ نے ساقی نامہ میں جو نعرہ پیکار بلند کیا ہے وہ محافظانہ اور مصلحانہ دونوں پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ ممولے کو شہباز سے لڑنے پر اس لئے آمادہ کرتے ہیں، تاکہ شہباز ممولے کو مقاومت پر آمادہ دیکھ کر اپنے پنجے ممولے کے خون میں رنگنے سے گریز کرے۔ علامہ چونکہ افراد و ملل کی زندگی اور موت کے متعلق گہرے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ :۔

> تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
> ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اس لئے وہ کسی کو نحیف و نزار نہیں دیکھنا چاہتے خواہ ممولہ ہو یا مزدور یا غلام سب کو وہ اپنے سے غالب اور غاصب طاقت کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کی دعوت دیتے ہیں ساقی نامے میں خود کہتے ہیں :۔

> اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے — لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اور ایک دوسرے نظم میں اس دعوت کو " فرمانِ خدا " بنا دیتے ہیں۔

فرشتوں کو حکم ملتا ہے۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

علامہ کے مطالعہ اور مشاہدہ کی حدود بہت وسیع تھیں۔ وہ دنیا کے سیاسی اور سماجی حالات پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ وہ اپنی دور رس نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ زمانے کے انداز بدل رہے تھے۔ نئے سیاسی اور معاشی نظام ہائے فکر جنم لے رہے ہیں فرنگی شاطروں کے راز افشا ہو رہے ہیں۔ لوگ بادشاہت کے خلاف اٹھ رہے ہیں۔ اسی اندازِ بصیرت کی بدولت وہ انقلابِ چین رونما ہونے سے کئی سال پہلے چینیوں کو یہ نوید مسرت سناتے ہیں:۔

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے؛

اقوامِ عالم کے دورِ بیداری کا جائزہ لیتے ہوئے علامہ مسلمانوں کی زندگی کو جانچتے اور پرکھتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

تمدن تصوف شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

ان اشعار سے واضح ہے کہ علامہ کلّی طور پر تصوف اور صوفی کے مخالف نہیں ہیں جس طرح کہ ان کے کلام کو سرسری نظر سے دیکھنے والوں نے سمجھا ہے۔ وہ صرف عجمی تصوف کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور اس صوفی سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ جو بے عمل ہے زندگی سے گریز اختیار کرتا ہے اور عجم کے خیالات میں کھویا رہتا ہے۔ وہ اس تصوف کے قدر دان ہیں، جو باطنی قوت بخشتا ہے اور کشمکش حیات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی دعوت دیتا ہے۔ جس کی بدولت انسان اپنے اندر خلیفۃ الارض اور اشرف المخلوقات بننے کی صلاحیتیں پیدا کرتا ہے، اقبال کی نظر میں وہ صوفی قابل صد احترام ہے۔ جو خدمت حق میں مرد محبت میں یکتا اور حمیت میں فرد ہو۔ اقبال شاعر حیات ہیں۔ انہیں زندگی سے پیار ہے۔ وہ دنیا کی تعلیم کو، جو عجمی تصوف کا ایک اہم جزو ہے، اسلامی تعلیم کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ ایرانی فلسفہ اور فارسی شاعری کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ عجمی تصوف نے اسلام کو طاقت اور قوت سے عاری کیا ہے۔ حافظ کی انہوں نے "اسرار" میں اسی نقطہ نظر سے مخالفت کی ہے ورنہ بحیثیت شاعر وہ حافظ کی عظمت کے قائل ہیں رومی اور جامی ..... کو انہوں نے اسی لئے سراہا ہے۔ عجمی تصوف کی اجتماعی نقطہ نظر سے مخالفت کرنے کے علاوہ اقبال تصوف کے عجمی پہلو سے ذاتی طور پر اس لئے بھی نالاں ہیں کہ اس سے انسانی شخصیت کے کچلے جانے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ وہ طبعاً انسانی شخصیت کے ارتقاء کی زبردست حامی ہیں۔ ان کی نظر میں غایت انسان یہ ہے کہ اسے معراج حاصل ہو۔ وہ اس مقام تک پہنچے۔ جہاں اسے معناً حقیقتِ کبریٰ کا ادراک حاصل ہوا ہے اصطلاح میں خدا سے کلام کرنا کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں منصب انسان ادراک حقائق ہے۔ تسخیر فطرت

صرف ادراک حقائق سے ممکن ہے۔ ادراک حقائق کے لئے جو امنگ یا تمنا انسان کے رگ و ریشے میں جاری و ساری رہے۔ وہ عشق ہے۔ اسی لئے وہ انسان کو یہ پیغام دیتے ہیں :۔

بڑھے جا یہ سنگِ گراں توڑ کر　　طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت　　تجھے کیا بتاؤں تیری سرنوشت

علامہ کی نگاہ میں قرآنی نقطہ نظر سے انسان کا جو اعلیٰ و ارفع مقام ہے جب وہ اپنے دور کے مسلمانوں کو اس کے حصول کے لئے کوشاں نہیں پاتے اور عجمی تصوف کی خواب آور تعلیم میں گرفتار پاتے ہیں۔ تو اس حقیقت حال سے انہیں دلی صدمہ پہنچتا ہے۔ اور کہہ اٹھتے ہیں :۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے　　مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اس احساس زیاں کی منزل پر پہنچ کر علامہ گھبرا کر مایوسی میں بے دست و پا نہیں ہو جاتے اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے نہیں کر دیتے، بلکہ ایک عظیم معمار کی طرح مسلمانوں کے وقار کی منہدم عمارت کی از سر نو تعمیر کے لئے سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کو بے عملی پژمردگی، تاریکی اور موت کی خطرناک و المناک فضا سے باہر نکالنے کے لئے انتہائی خلوص دردمندی اور سوز کے رنگ میں ڈوب کر اپنے ساقی سے یہ التجا کرتے ہیں :۔

شراب کہن پھر پلا ساقیا　　وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا　　مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر　　جوانوں کو پیروں کا استاد کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے　　دلِ مرتضیٰ! سوز صدیق دے
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے　　مرا عشق میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر　　　یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر

اس بند کی ظاہری اور معنوی صورت ایسی ہے کہ ہم اس بند کو دعا ، کہہ سکتے ہیں یہاں علامہ کا ساقی خدائے بزرگ و برتر کی ذات ہے جس کے حضور میں وہ انتہائی خضوع خشوع کے ساتھ نرمی اور ملائمت کے لہجے میں مسلمانوں کے حق میں دعا گو ہوتے ہیں اور اپنی تمناؤں کا اظہار کرتے ہیں۔ سادگی، بے تکلفی، تڑپ اور جاں نثاری کے پہلو ان اشعار میں بہت نمایاں ہیں۔ اس بند میں علامہ ایک عمر رسیدہ متین اور دنیا کے نشیب و فراز دیدہ انسان کی طرح خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی ملت کا دکھڑا بیان کرتے ہیں اور نظر کرم کے طالب ہوتے ہیں۔ ایک شوخ اور بیباک نوجوان کی طرح اپنے لبوں کو حرف "شکوہ" سے آشنا نہیں کرتے ہیں۔

سر تا پا خلوص اور سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی دعا کے بعد علامہ زندگی کی حقیقت کو یوں الفاظ واضح کرتے ہیں :-

دما دم رواں ہے یم زندگی　　　ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود　　　کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود

گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل　　　خوش آئی اسے محنت آب و گل
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی　　　عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی　　　فقط ذوق پرواز ہے زندگی

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند　　　سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز | سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے | تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات | ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس | ازل سے ابد تک رم یک نفس

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

زمانے کو انمٹ نقش قرار دے کر اور زمانے کی حقیقت واضح کرنے کے بعد علامہ اپنا تصور خودی اور اس سے متعلق مباحث نہایت سادہ اور دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں۔ فارسی سے ناآشنا لوگوں کے لئے اردو میں خودی کے متعلق علامہ کے خیالات اس سے بہتر صورت میں کسی دوسری جگہ بیان نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ تمام اردو شاعری میں خودی کے موضوع پر ان اشعار سے بہتر اشعار موجود نہیں ہیں۔ بطور امثال چند اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات | خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی، جلوہ بدمست و خلوت پسند | سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک | من و تو میں پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے | نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی | دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی!

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں | پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں

کرن چاند میں ہے شفق میں ہے
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

خودی کے نگہبان کو ہے زہر ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اسکی آب

خودی کی یہ ہے منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں ؟

خودی شیر مولا جہاں اسکا صید
زمیں اس کی صید آسماں اسکا صید

یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

تو ہے فاتح عالم خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تیری سرنوشت

ساقی نامہ میں پیش کردہ موضوعات اگرچہ فلسفہ اور تاریخ کے خشک مسائل ہیں، لیکن اسلوب کی دلکشی کی وجہ سے وہ پڑھنے والے کو ناگوار نہیں گزرتے۔ شاعر نے اس طویل نظم میں ایجاز کے ایسے کرشمے دکھائے ہیں کہ فن شاعری میں ان کے اعجاز مسیحائی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انہوں نے مردہ لفظوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ بعض صورتوں میں ایک لفظ کے سہارے پوری ایک داستان سنا دی ہے۔ "لالہ" اور "صوفی" ایسے ہی لفظ ہیں۔ اکثر مصرعوں میں نہایت موثر اور دلچسپ پیرایہ میں ایسی طویل اور وسیع مطالب قلمبند کر دیئے ہیں جن کے بیان کے لیے دوسروں کو فلسفہ اور تاریخ کے کئی صفحے لکھنے کی ضرورت پڑے۔

علامہ نے ساقی نامہ مثنوی کی طرز میں لکھا ہے اور اس کے لئے بحر متقارب مقصور یا محذوف اختیار کی ہے جس کا وزن فعولن، فعولن، فعول یا فعل ہے میر حسن کی معروف مثنوی سحر البیان بھی اسی بحر میں ہے۔ . . . . اس بحر کے متعلق سید انشا و دریائے

لطائف میں لکھتے ہیں۔ ''این بحر مخصوص است مذکور محاربات سلاطین یا ...
سلاطین''۔ دریں صورت یہ کہنا پڑتا ہے کہ علامہ نے ساقی نامہ کے لئے ایک ایسی
بحر منتخب کی ہے۔ جو ان کے لہجے اور نفس مضمون سے پوری مطابقت رکھتی ہے کیونکہ
گذشتہ سطور میں اس حقیقت کا اظہار کیا جاچکا ہے کہ ساقی نامے کا مقصد دراصل
دعوتِ انقلاب ہے۔ اس کی حیثیت رجز نامے کی ہے۔

ساقی نامہ چونکہ مثنوی کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ اس لئے مثنوی نگاری
کے فن کو سامنے رکھتے ہوئے بھی اس کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے، فارسی
میں فلسفیانہ موضوع کی حامل جو مثنویاں کامیاب سمجھی گئی ہیں ان کے پیشِ نظر ایک
کامیاب مثنوی کے لئے ضروری ہے کہ بیان میں ربط و تسلسل ہو۔ وضاحت
اور سادگی ہو۔ بحر موضوع کے مطابق ہو۔ پڑھنے والے کی دلچسپی اول سے آخر تک
قائم رہے۔ ان حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ساقی نامہ کے مطالعہ کے بعد ہم یہ کہہ
سکتے ہیں کہ ساقی نامہ اردو کی ایک کامیاب فلسفیانہ مثنوی ہے کیونکہ ساقی نامہ
تمام مذکورہ شرائط پہ پورا اترتا ہے۔ اردو میں اب تک جو مثنویاں لکھی گئی ہیں
ان میں سے میر حسن کی مثنوی سحر البیان، دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزارِ نسیم اور نواب
مرزا شوق کی مثنوی زہرِ عشق کو مقبولیت کا شرف حاصل ہے۔ یہ سب مثنویاں عشقیہ
رنگ کی ہیں اردو میں فلسفیانہ اور اخلاقی مثنویوں کا اگر سراغ لگایا جائے۔ تو
قدیم دکنی شعراء کے علاوہ ہم میر، میر اثر اور میر حسن کی بعض غیر معروف مثنویوں
تک پہنچتے ہیں۔ ان مثنویوں میں سے بیشتر فارسی مثنویوں کے ناکام ترجمے ہیں اور
زبان و موضوع کے اعتبار سے قابلِ قدر ادب پارے نہیں ہیں یہی وجہ ہے
کہ انہیں شہرت و مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ اس صورت میں کہا جاسکتا
ہے کہ علامہ کا ساقی نامہ اردو کی فلسفیانہ مثنویوں میں نمایاں حیثیت کا

مستحق ہے۔

گذشتہ مباحث سے واضح ہے کہ علامہ کا سائنسی نامہ صرف علامہ کے اردو کلام میں ہی غیر معمولی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اردو شاعری میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی اہمیت گوناگوں ہے۔ اردو ادب کا جائزہ لینے والا اردو سائنسی نامول کا جائزہ لے یا اردو مثنویوں کا یا اردو نظموں کا یہ ناممکن ہے کہ وہ علامہ کے اردو سائنسی نامے کا نمایاں صورت میں ذکر نہ کرے اور اسے ایک اعلیٰ فن پارہ قرار نہ دے اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں کے افکار کی تاریخ لکھنے والے کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ علامہ کے نظام فکری کا تذکرہ کرے اور سائنسی نامے کا حوالہ دیئے بغیر اپنی تصنیف کو مکمل سمجھ لے۔

اقبال حضورِ رسالتمآب میں

خدا کی حمد و ثنا کے بعد رسولِ کریم کی مدح و ستائش میں شعر کہنا عربی اور فارسی شعراء کا قدیم دستور ہے۔ اُردو شاعری نے چونکہ فارسی شاعری کے زیرِ اثر ابتدائی ارتقائی مراحل طے کئے۔ اس لئے فارسی کی روایاتِ شعری کا جو خزانہ اُردو میں منتقل ہوا، اس میں یہ مستحسن روایت بھی شامل تھی۔ نعت اسی سلسلہ کی ایک ترقی یافتہ کڑی ہے۔

علامہ اقبال نے جہاں بعض تشبیہوں، استعاروں، تلمیحوں اور علامتوں کو اپنے کلام میں نئی معنوی زندگی بخشی ہے اور روایات کی کہنگی کو تازگی میں تبدیل کیا ہے۔ وہاں انہوں نے اندازِ منقبت بھی دوسروں سے مختلف اور جداگانہ اختیار کیا ہے۔ شاعرِ مشرق نے حضور رسالت مآب میں جہاں بھی عقیدت کے پھول پیش کئے ہیں، محض روایت کی پشت پناہی کے خیال سے نہیں بلکہ اس محبت اور عقیدت کے جذبہ سے سرشار ہو کر کئے ہیں جو انہیں رسولِ مقبول کی ذاتِ گرامی سے بدرجہ کمال تھی یہی وجہ ہے کہ ان پھولوں سے، جن کو شاعر کی قلبی گہرائیوں نے نزودتازگی بخشی ہے، بے پناہ خلوص و صدق کی خوشبو آتی ہے۔

علامہ سے پیشرو شعراء بالعموم اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ مثنوی کی

صورت میں آغاز حمد و ثنا سے کرتے اور پھر رسولِ کریم کی عظمت کے ترجمان اشعار کہتے۔ اگر غزل کہہ رہے ہوتے تو مطلع اسی انداز کا ہوتا یا غزلوں کے مجموعہ یعنی دیوان کی ترتیب میں اسی رعایت کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا۔ لیکن جب ہم علامہ کی شعری تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی زندگی کے دورِ اول کا کلام اس رجحان کا مظہر نہیں نظر آتا۔ بانگِ درا حمد و نعت کے بجائے پہلی نظم کوہ ہمالہ ہے، یہی نہیں بلکہ ۱۹۰۸ء تک کے کلام میں رسولِ کریم سے متعلق جو اشعار ہیں، ان کی تعداد دس بارہ سے نہیں زیادہ۔ اس صورتِ حال کے دو اسباب ہو سکتے ہیں، پہلا یہ کہ اس دور میں علامہ کو سرورِ کائنات سے اتنا لگاؤ نہیں تھا جتنا بعد کے دور کے کلام میں نمایاں ہے دوسرا یہ کہ انہوں نے روایت کی پابندی سے گریز کی خاطر ایسا کیا ہے پہلے خیال کی تردید اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ عشقِ رسول علامہ کو اپنے صوفی منش والد بزرگوار سے وراثت میں ملا تھا۔ اور ان کے استادِ معظم علامہ میر حسن نے اس میں مزید گہرائی اور گیرائی پیدا کر دی تھی دوسرے خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے۔ کہ ان کی مثنوی اسرارِ خودی کا آغاز بھی روایتی انداز میں نہیں ہوا ہے، حالانکہ یہ مثنوی سنہ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی تھی اور اسے لکھتے ہوئے علامہ کا عقیدہ یہ تھا کہ ؎

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است

بہر صورت رسولِ کریم سے غیر معمولی لگاؤ کا اظہار علامہ کی جس دور کی شاعری میں نمایاں ہے، وہ ان کی شاعری کا تیسرا دور ہے جس کا آغاز یوں تو ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپسی کے بعد ہوا۔ لیکن جس کے نقوش ۱۹۱۲ء سے زیادہ نمایاں اور واضح نظر آنے لگے۔ اسی سال ترجمانِ حقیقت نے مسلم

کے عنوان سے نظم لکھتے ہوئے اپنے مسلم ہونے کا اعلان کیا اور اہلِ محفل کو تیرہ سو سال پہلے کی داستان بدیں صورت سنائی۔

ہم نشیں! مسلم ہوں میں، توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں
ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں
اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں

اس سے اگلی نظم کا عنوان ہی "حضور رسالت مآب میں" ہے۔ اس نظم میں فرشتے شاعرِ ملت کو بزمِ رسالت میں لے جاتے ہیں اور حضور سرورِ کائنات ان سے استفسار فرماتے ہیں:۔

نکل کے باغ جہاں سے بہ رنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

علامہ جواب میں عرض کرتے ہیں:۔

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

پھر ایک نظم چھوڑ کر دوسری نظم "جواب شکوہ" میں ملت سے یوں شکایت کرتے ہیں:۔

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار
مصلحت وقت ہے کس کے عمل کا معیار

کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار | ہو گئی کس کی نگاہ طرزِ سلف سے بیزار
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں | کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

ملت کو اس کے زوال کے اسباب سے آگاہ کرنے کے بعد یہ اعلان فرماتے ہیں ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں | یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

بانگِ درا کے تیسرے حصے کی نظموں میں ہی ایسے اشعار نہیں ملتے ہیں بلکہ اس دور کی غزلوں میں بھی یہ رنگ جھلکیاں دکھاتا ہے۔ مثلاً پہلی غزل کا مطلع ہے۔

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

بانگِ درا کے علاوہ دوسرے شعری مجموعوں میں بھی اس مضمون اور رنگ کے اشعار جستہ جستہ موجود ہیں۔ لیکن دو مجموعے ایسے ہیں کہ جس سے اس انتہائی درجہ کی گہری محبت کا اظہار ہوتا ہے جو اس دور میں علامہ کو رسولِ کریم کی ذات اقدس سے ہو گئی تھی اور جسے ہم عشقِ رسول سے تعبیر کر سکتے ہیں یہ مجموعے اسرار و رموز اور ارمغانِ حجاز ہیں۔ اسرار و رموز میں خودی بیخودی کے تصورات پیش کرتے ہوئے دانائے راز صاحبِ خودی کے لئے پہلی منزل اطاعت کی قرار دیتے ہیں اور اس میں جن حدود کی پابندی کی تلقین کرتے ہیں وہ رسول اللہ ہی کی مقرر کردہ ہیں۔ اس لئے فرماتے ہیں ؎

شکوہ سنج سختیِ آئیں مشو | از حدودِ مصطفےٰ بیروں مرو

علامہ کے خیال میں وہی شخص مومن یا صاحبِ خودی کا مرتبہ حاصل کر سکتا ہے جو رسولِ کریم کے اسوۂ حسنہ کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے سرگرم عمل ہو

حقیقت یہ ہے کہ علامہ نے اپنے مردِ مومن کو رسولِ کریم کی ذاتِ والاصفات ہی میں دیکھا ہے۔ رسولِ کریم کی شان میں لکھتے ہیں :-

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت — تا چراغِ یک محمدؐ برفروخت
در جہاں آئینِ نو آغاز کرد — مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد

پھر رموزِ بیخودی میں جب فرد اور ملت کے رشتہ کو واضح کرتے ہیں تو جس ملت کا تصور پیش کرتے ہیں، وہ ان کے محبوب حضرت محمدؐ مصطفےٰ ہی کی امت ہے۔ اسی ملت میں گم ہو کر وہ انسان کو اپنی انفرادی خودی سے بے نیاز ہو جانے کی دعوت دیتے ہیں۔ علامہ کی نظر میں اسلامی ملت کا دوسرا اساسی رکن رسالت ہی ہے اس سلسلہ میں ان کے یہ اشعار شنیدنی ہیں :-

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید — وز رسالت در تنِ ما جاں دمید
حرفِ بے صوت اندریں عالم بُدیم — از رسالت مصرعِ موزوں شدیم
قوتِ قلب و جگر گردد نبی ! — از خدا محبوب تر گردد نبی !
پس خدا برما شریعت ختم کرد — بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را — او رسل را ختم، ما اقوام را !

عشقِ رسول کا اظہار صرف شعروں کی صورت میں ہی نہیں ملتا، عاشقِ رسول کی دوسری تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً نیاز الدین خاں کو ۴ر جنوری ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں :-

" نبیِ کریم کی زیارت مبارک ہو۔ اس زمانے میں یہ بڑے سعادت کی بات ہے۔ دوسری رؤیا کا بھی یہی مفہوم ہے، قرآن کثرت سے پڑھنا چاہیے تا کہ قلب محمدی نسبت پیدا کرے اس نسبتِ محمدیہ کی تولید کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ...

قرآن کے معنی بھی آتے ہوں۔ خلوص دل کے ساتھ محض قرأت کافی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریمؐ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں۔ جس طرح صحابہؓ ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہوگا۔ اس واسطے خاموش رہتا ہوں۔"

کیا عاشقِ رسول خاموش رہ سکا! اقبالیات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس سوال کا جواب نفی کی صورت میں دنیا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مصلحت اندیشی عشق کا مقابلہ نہ کر سکی اور حکیم الامت بلا خوف وخطر اپنے عقائد کا اظہار کرتے رہے۔

"ارمغانِ حجاز" میں "مے عشقِ رسول" تیز سے تیز تر ہوگئی۔ اس مجموعہ میں رحمت العالمین سے علامہ کا لگاؤ معراج پر ہے۔ اس مجموعے کی ترتیب کا انداز بھی قدیم ہے۔ علامہ شروع میں بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں اور پھر حضورِ رسالتِ مآب میں علامہ اس زمانے میں حج کے لئے جانے کا بھی ارادہ رکھتے تھے لیکن نہ جا سکے۔ ارمغانِ حجاز میں اسی سفرِ حج کے متعلق خیالات کو انہوں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں اتار کر تجربات کی صورت میں بخشی ہے جس سے انہیں ایک روحانی خوشی حاصل ہونے کے علاوہ ان کے کلام میں شاعرانہ عظمت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ اسی خیال سفرِ حج کے دوران میں علامہ ملتِ کے انحطاط پذیر زندگی کو بدلنے کے لئے رسولِ کریمؐ سے یوں صورت نگاہِ کرم کے طالب ہوتے ہیں:-

مسلماں آں فقیرِ کج کلاہے — رمید از سینۂ او سوزِ آہے!
دلش نالد! چرا نالد، نداند — نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

اور پھر "غم یاراں" کے بیان کے بعد اپنا فیصلہ اس طرح سناتے ہیں:۔

بگوے تو گذارہ یک نوا بس — مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس
خراب جرأت آں رندِ پاکم — خدا را گفت ما را مصطفےٰ بس

علامہ خدا کے ساتھ تو شوخیاں روا رکھتے ہیں اور یہاں تک کہہ دیتے ہیں:۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

لیکن حضور رسالت مآب میں خودی سرنگوں نظر آتی ہے اور علامہ عجز و انکسار کا پتلا بنے نظر آتے ہیں کیونکہ ان کا تو عقیدہ یہ تھا:

می توانی منکرِ یزداں شدن — منکر از شانِ نبی نتواں شدن
مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبال کا نظریۂ حیات

تاریخ شاہد ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر نے جب وفات پائی تو حکومت کی باگ دوڑ اس کے ایسے جانشینوں کے قبضہ میں آئی کہ جو نا اہل کمزور اور ریاست کے رموز سے بے خبر تھے، وہ اپنی حکومت کو اس زہر کے اثرات سے محفوظ نہ رکھ سکے جو بمرورِ ایام جسدِ ملت میں سرایت کر چکا تھا اور انتشار، افتراق، گوشہ نشینی، عیش کوشی اور تن آسانی جس کے مختلف روپ تھے، اس زہر کے زیر اثر شاعر اس قسم کے شعر کہنے لگے تھے۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے یہ نمائش سراب کی سی ہے

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

ترکِ دنیا کی تعلیم جو اس انداز میں دی گئی تو اس کا اثر تیغ زنی کے جوہر دکھانے والوں پر جو ہوا، اس کا اندازہ وحید خاں پٹھان کے اس شعر سے بخوبی ہو سکتا ہے:۔

تھے ہم پوت پٹھان کے دل کے دل دیں موڑ

چرخی جب سے رگنا تھا کے سکیں نہ تنکا توڑ

اس جرم ضعیفی کی سزا تقدیر کے قاضی نے ۱۸۵۷ء میں جو سنائی، اس کے آثار اب تک آپ کے سامنے ہیں۔ برصغیر کے مسلمان اپنی حکومت کھو بیٹھے اور

ایک ایسی قوم سے بھی کمتر حیثیت قبول کرنے پر مجبور ہوگئے کہ جو کئی سو سال ان کے تابع فرمان رہی تھی، محکومی کا نیا دور بنت ہی حوصلہ شکن تھا لیکن۔

ع

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

جب ملک ہاتھوں سے نکل گیا تو ملت کی آنکھیں کھل گئیں۔ قانونِ قدرت برنگِ دگر سامنے آیا۔ غیرتِ حق حرکت میں آئی اور سرسید احمد خاں کے سہارے برصغیر کے مسلمان پھر سنبھلنے لگے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مغربی تہذیب اپنانے اور جدید علوم سے بہرہ ور ہونے کا مشورہ دیا۔ اس سلسلے میں انتہاپسندی کے جو خطرات تھے، ان سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اکبر الہ آبادی نے نئی تہذیب کو طنز کا ہدف بنایا لیکن ان کی کوششوں کو بدرجہ کمال پہنچانے اور مسلمانوں کی محکومی کے اصل سبب اور اس کے مداوا کی نشاندہی کی سعادت حکیم الامت علامہ اقبال کی قسمت میں تھی۔ ان کو مغرب میں قیام کے دوران مغرب کی تہذیب جھوتے نگوں کی ریزہ کاری نظر آئی اور مادی ترقی کا کھوکھلا پن شدت کے ساتھ محسوس ہوا۔ بدیں سبب راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ان کی نظریں مغرب کی جانب نہیں، مشرق کی طرف اٹھیں، فلسفہ عجم کے متعلق ڈاکٹریٹ کے لئے اپنا تحقیقی مقالہ لکھتے ہوئے وہ اس نتیجہ پہ پہنچے کہ مسلمانوں کے زوال کا باعث ترکِ دنیا کی تعلیم ہے۔ اس حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد دانائے راز نے اپنی ملت کو یہ پیغام سنایا کہ صرف اس نظریہ حیات کو اپنا کر وہ عظمتِ رفتہ دوبارہ حاصل کر سکتی ہے جس کا ماخذ قرآن قریم اور جس کا عملی نمونہ رسول پاک کی ذات گرامی تھی، مرض کی صحیح تشخیص اور اس کا واضح اور قطعی علاج سامنے آنے کا یہ فائدہ ہوا کہ ۱۹۲۶ء میں برصغیر کے مسلمانوں کا مستقبل صاف نظر آنے لگا۔ یہ شعور اور احساس اس نظریہ حیات کی بدولت پیدا ہوا، جس کی تبلیغ و

اشاعت کا اہتمام حکیم الامت نے اپنے خطبات، مضامین، مکاتیب اور اشعار کی صورت میں کیا تھا۔ ان کے شعری مجموعوں میں ان کے نظریہ حیات کے ترجمان سینکڑوں اشعار موجود ہیں۔ ارتقاء کے عنوان سے ایک نظم میں کشاکش پیہم کو ان الفاظ میں زندگی قرار دیتے ہیں :۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز — سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

"ساقی نامہ" میں زندگی اور خودی کا تعلق یوں صورت ظاہر فرماتے ہیں :۔

دما دم رواں ہے یم زندگی — ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
یہ موجِ نفس کیا ہے، تلوار ہے — خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیدارئ کائنات

ایک غزل میں ذوقِ نمود کی اہمیت اس طرح واضح کرتے ہیں :۔

بے ذوقِ نمود زندگی موت — تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی

اس انداز کے اشعار کے علاوہ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں فرد اور ملت کے حوالہ سے شاعرِ مشرق نے جامع اور واضح انداز میں اپنا نظریہ حیات پیش کیا ہے۔ ان مثنوی میں سب سے زیادہ زور مقاصد پہ دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم　　از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

زندگانی را بقا از مدعا است　　کاروانش را درا از مدعا است

شاعرِ مشرق نے مقاصد کی اہمیت بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو اس اعلیٰ نصب العین سے آگاہ کیا ہے جو فقط حکمرانی اور اقتدار حاصل کرنے کا نصب العین نہیں بلکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس کے اعلیٰ مقام سے آگاہ کرنے کا نصب العین ہے۔ یہ ایک ایسا مقام تھا جس کے نتیجہ میں سیاسی آزادی کا حصول اور ایک آزاد خود مختار مملکت کا قیام ایک امر ناگزیر تھا۔ اس اعتبار سے شاعرِ مشرق صرف تصورِ پاکستان کے خالق نہیں، پاکستان کے خالق تھے کیونکہ انہوں نے وہ تمام بنیادی تقاضے پورے کر دیے تھے جو ایک با مقصد معاشرے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ معاشرہ چونکہ افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس لیے ترجمانِ حقیقت نے اپنی یہ تمنا ظاہر کی کہ ہر مسلمان عظمت انسان کا ترجمان ہو، خودداری، غیرت، شجاعت اور حق گوئی کا پتلا ہو، مسلسل تگ و دو اس کا شیوہ ہو۔ صداقت، عدالت، انصاف، مساوات، ہمدردی، ایثار، مروت، رواداری، سخاوت، فراخ دلی اور اسی قسم کے دوسرے اعلیٰ اوصاف سے وہ متصف ہو کر حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرے تاکہ صحیح معنوں میں خلیفۃ الارض یا نائب الٰہی یا مومن یا صاحبِ عشق کہلوانے کا مستحق بن سکے اور تسخیرِ کائنات کا فرض ادا کر سکے۔ تعلیماتِ اقبال کے ان بنیادی اجزا ہی سے فی الحقیقت ان کا نظریہ حیات عبارت ہے۔

چونکہ حکیم الامت قرآنِ حکیم کو ایک مکمل ضابطہ حیات سمجھتے تھے اس لیے مسلمان کے لئے ان کا یہ مشورہ ہے کہ ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن　　نیست ممکن جز بقرآں زیستن

بقول خلیفہ عبدالحکیم مرحوم حضرت علامہ کا یہ عقیدہ تھا کہ قرآن پاک بھی ماہیت حیات اور نفس انسانی کی طرح اپنے اندر لامتناہی زندگی رکھتا ہے۔ انسانی زندگی کے مزید ارتقا میں کوئی دور ایسا نہیں آسکتا جس میں قرآنی حقائق کا نیا انکشاف ترقیٔ حیات میں انسان کی رہبری نہ کر سکے، زندگی کی تو یہ نوصورتیں پیدا ہوتی جائیں گی لیکن قرآن کے اساسی حقائق کبھی دفتر پارینہ نہ بنیں گے۔

شاعر مشرق اسلام یا قرآن کو صرف دنیا ہی میں سرخروئی کا ضامن نہیں سمجھتے تھے، بلکہ آخرت میں بھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مسولینی کو دوران گفتگو یہ مشورہ دیا تھا کہ۔

"آپ نے ڈسپلن کے اس اصول کو ضرور اپنایا ہے، جسے اسلام انسانی نظام حیات کے لئے بہت ضروری سمجھتا ہے لیکن اگر آپ اسلام کے نظریہ حیات کو پوری طرح اپنالیں تو آپ کو دنیا و عقبیٰ میں سرخروئی نصیب ہو گی۔"

مسولینی سے سلسلہ میں دانائے راز کا ایک دوسرا مشورہ بھی آج ہمارے لئے مشعلِ راہ بن سکتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ "مسولینی کا اصول یہ تھا کہ جس شخص کے پاس فولاد ہے، اس کے پاس روٹی ہے لیکن میں اس میں ترمیم کر کے کہتا ہوں کہ جو شخص خود فولاد ہے، اس کے پاس سب کچھ ہے، سخت بن جاؤ اور سخت محنت کرو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا یہی ایک راز ہے۔ ہمارا نصب العین بالکل معین اور واضح ہے، وہ نصب العین یہ ہے کہ آئندہ دستور میں اسلام کے لئے ایسا مقام اور ایسی حیثیت حاصل کی جائے کہ وہ اس ملک میں اپنی تقدیر کے منشا کو پورا کرنے کے مواقع پا سکے۔ اس نصب العین کی روشنی میں یہ ضروری ہے کہ قوم کی ترقی پسند قوتوں کو بیدار کیا

جائے۔ شعلۂ حیات دوسروں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا۔ وہ صرف اپنی روح کے آتشکدے میں روشن کیا جا سکتا ہے۔"

اس سلسلہ میں ممتاز حسن کی ایک روایت بھی سبق آموز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ علامہ اقبال سے مجھے جو سب سے زیادہ قیمتی کلمہ حکمت ملا، وہ یہ ہے کہ "زندگی کا کوئی لمحہ بیکار نہ گزرے، حکمت کے اس گوہر یکتا کی جھلک ان اشعار میں بھی دیکھئے ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی	اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے
تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل	چیست حیات دوام سوختن ناتمام
ہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں	یہاں سینکڑوں آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا	کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

میں سمجھتا ہوں کہ شاعر مشرق کی یاد منانے کی سب سے اعلیٰ اور ارفع صورت یہی ہے کہ ہم سخت محنت کرنے کا عہد کریں کیونکہ ان کے نظریہ حیات کا یہ ایک بنیادی تقاضا ہے۔

———☆———

علّامہ اقبال کا پیامِ تسخیرِ فطرت

مجھے کامل یقین ہے کہ علّامہ اقبال اگر اس دور میں زندہ ہوتے تو مشرق اور مغرب مسلم اور غیر مسلم کے امتیاز سے بالکل آزاد ہو کر ان سائنسدانوں کو ضرور خراج عقیدت پیش کرتے جنہوں نے چاند اور مریخ تک انسان کی رسائی کو ممکن بنا دیا ہے، کیونکہ ان کا ارشاد ہے کہ

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

علّامہ اقبال نے جن مختلف موضوعات کو اشعار کے قالب میں پیش کیا ہے ان کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ تسخیر فطرت ان کا ایک محبوب موضوع ہے۔ "پیام مشرق" میں "تسخیر فطرت" کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے۔ "اسرار و رموز" میں اس کے متعلق دو مختلف باب ہیں۔ "بال جبریل" میں چند غزلوں کے علاوہ "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں" اور "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" دو ایسی نظمیں ہیں جن کا نفس مضمون تسخیر فطرت سے عبارت ہے۔ "بانگ درا" میں شامل بعض نظموں کا بھی اس موضوع کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ مثلاً انسان اور بزم قدرت، سرگزشت آدم، جواب شکوہ اور انسان ان مخصوص نظموں کے علاوہ بھی علّامہ کے مختلف مجموعہ ہائے کلام میں تسخیر فطرت سے متعلق متعدد اشعار موجود ہیں:۔

محولہ نظموں اور اشعار کی روشنی میں تسخیر فطرت سے متعلق اقبال کے نظریات

بیان کرنے سے پہلے ان عوامل کی نشاندہی ضروری ہے، جن کے زیر اثر تسخیر فطرت اقبال کا محبوب موضوع بنا اور اس مضمون کے گوناگوں پہلوؤں پر انہوں نے طبع آزمائی کی۔

تاریخ شاہد ہے کہ جس زمانے میں مسلمانوں کو اقوام عالم میں اقتدار حاصل تھا اس دور میں مغربی اقوام قعر مذلت میں گری پڑی تھیں۔ لیکن بمرور ایام حالات بدل گئے۔ گردش روزگار نے حیات ملل کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ مسلمان خواب غفلت کا شکار ہو گئے اور تنزل و پستی کی راہ پر چل پڑے۔ مغربی اقوام تمام عالم اسلام پر غالب آگئیں ترقی کے مراحل طے کرنے لگیں اور اب وہ چاند اور ستاروں پر کمند تک اڑنے کے لئے کوشاں ہیں اور فضائی سفر میں حیران کن کامرانی سے ہمکنار ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کو حصول عروج کے بعد کیوں زوال نصیب ہوا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے منظم صورت میں پہلی بار ۱۸۵۷ء میں محکوم بننے کے بعد اس سوال کے جواب کے متعلق غور و فکر کیا۔ سرسید اور ان کے رفقاء کی کوششیں اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے بے عملی اور ترک دنیا کی تعلیم کو مسلمانوں کے زوال کے دو اہم سبب سمجھا اور ان اسباب کی بیخ کنی کے لئے سرگرم عمل ہوئے۔ اردو شاعری میں حالی نے مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی کا جلوہ دکھا کر اپنے حال کو بہتر بنانے کی بدیں الفاظ دعوت دی۔

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا

کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں!!!

کمال کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے

یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی!

باپ کا ہے جبھی پسر وارث ہو ہنر کا بھی اس کے گر وارث

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک

تو ہیں وہ چند روزہ دنیا میں مہماں ہیں

علامہ نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا، تو سرسید کی اصلاحی ... تحریک سے دیگر افراد ملت کی طرح وہ بھی متاثر ہوئے اور حالی کی طرح مسلمانوں کو درس عمل دیتے ہوئے دنیا ترک کرنے سے روکنے لگے ان کی شاعری کے ابتدائی دور کی ایک نظم "سید کی لوح تربت" کا یہ شعر اس بات کی روشن دلیل ہے۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں   ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

اقبال دنیا ترک کرنے کی بجائے دنیا کو مسخر کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ وہ صوفیا کے اس گروہ سے نالاں ہیں جو ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری   کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری

میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا   تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

فطرت کو خرد کے روبرو کر   تسخیر مقام رنگ و بو کر

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے   جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کیلئے

حالی نے اپنی افتاد طبع کے مطابق مسلمانوں کو اپنی اصلاح کے لئے دھیمی آواز میں پکارا لیکن اقبال کی ہنگامہ پرور طبیعت نے انہیں "نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کمیابی" کے اصول پر عمل پیرا ہونے پر مجبور کیا۔ نتیجۃً اقبال ہمیں مختلف صورتوں میں تمام انسانوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص دعوت عمل دیتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے کلام میں عمل کی تین راہوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ حقیقت میں تسخیر فطرت کی ہی مختلف صورتیں ہیں انبیاک قرانی افکار کے مطابق انسان کو

اشرف المخلوقات، اور نائب الٰہی سمجھتے ہوئے انسان کا یہ فرض اولین سمجھتے ہیں کہ وہ تسخیر فطرت کے لیے ہمیشہ مصروف عمل رہے اور اس عالم رنگ و بو کو حسین سے حسین تر بنانے کی کوشش کرتا رہے۔ جو انسان اس فرض کو ادا نہیں کرتا۔ وہ خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، وہ دنیا میں عروج حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ زندہ رہنے کا مستحق نہیں کیونکہ :۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

فرد کے علاوہ قوم کی زندگی بھی اسی اصول کے مطابق گزرتی ہے۔ ایک قوم اگر مجموعی صورت میں بے عملی کا شکار ہو جائے۔ ہنر و فن سے بیگانہ رہے تو وہ قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ مسلمان اسی صورت میں زوال پذیر ہوئے۔

اور اپنی میراث کھو بیٹھے۔ "جواب شکوہ" میں اقبال مسلمانوں کو ان کے زوال کے اسباب سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہر مسلماں رگ باطل کے لیے نشتر تھا اس کے آئینہ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اسے قوت بازو پر تھا ہے تمہیں موت کا ڈر اس کو خدا کا ڈر تھا

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو

اس کے برعکس اگر کوئی قوم من حیث المجموع سعی و عمل کو اپنا شیوہ بنائے اور تسخیر فطرت کے لیے سائنس کی نئی نئی ایجادات کو بروئے کار لائے، تو ایسی قوم کا برسر اقتدار آنا لازمی امر ہے ملت اسلامیہ کے مقابلہ میں مغربی اقوام کو اقوام عالم میں اسی لئے عروج حاصل ہوا۔

علامہ اقبال ان حقائق کو اپنے کلام میں مختلف صورتوں میں کئی بار پیش کرتے ہیں تاکہ مسلمان حالات سے بخوبی آگاہ ہو کر اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو واپس لانے

کا کچھ مداوا کریں۔ اقبال کی شاعری کے ہر دور میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو مذکورہ انداز فکر و عمل کے ترجمان ہیں۔ بانگِ درا کے پہلے حصہ میں ایک نظم "انسان اور بزم قدرت" کے عنوان سے شامل ہے۔ اس نظم میں اقبال انسان کے منصب جلیل کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:-

باغباں ہے تری ہستی پئے گلزار وجود
ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود

بانگِ درا ہی میں ایک دوسری نظم "انسان" ہے انسان کے دائرہ عمل کی صورت ان الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

یہ ہستئ دانا ہے بینا ہے، توانا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی

"اسرار و رموز" میں اقبال تربیت خودی کے مراحل بیان کرتے ہوئے نیابت الٰہی کو تیسرا مرحلہ قرار دیتے ہیں اور حیات ملت کی وسعت کو قوائے نظام عالم کی تسخیر پر منحصر سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں:-

نائب حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است

نائب حق ہمچو جان عالم است
ہستئ او ظل اسم اعظم است

فطرتش معمور و می خواہد نمود
عالمے دیگر بیارد در وجود

نائب حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکم او محکم شود

جستجو را محکم از تدبیر کن
انفس و آفاق را تسخیر کن

اقبال عشق کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اس سے تسخیر فطرت میں مدد ملتی ہے۔ "اسرار و رموز" میں اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں ہوتا ہے۔

از محبت چوں خودی محکم شود
قوتش فرمانده عالم شود

پنجۂ او پنجۂ حق می شود!
ماہ از انگشت او شق می شود

بالِ جبریل میں انسان کی عظمت کا اظہار اقبال فرشتوں کی زبان سے

بدیں الفاظ کرتے ہیں :۔

سرِ ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

اسی نظم میں روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے اور اس کے میدانِ عمل کو ان الفاظ میں نمایاں کرتی ہے :۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے

ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

"پیامِ مشرق" میں تسخیرِ فطرت کے عنوان سے جو نظم شامل ہے، اس کے پانچ حصے ہیں۔ پہلے حصے میں آدم کی ولادت کا ذکر کیا گیا ہے اور آدم کی چند صفات بیان کی گئی ہیں۔ اس حصہ کے پہلے دو شعر شنیدنی ہیں :۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

دوسرے حصے میں ابلیس کا انسان کو سجدہ کرنے سے انکار کرنے کا واقعہ قلمبند کیا گیا ہے :۔

آدمِ خاکی نہاد، دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوشِ تو پیر شود در برم

تیسرے حصے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابلیس نے کس طرح آدم کو گمراہ کیا تھا۔

اس حصے کے حسبِ ذیل اشعار قابلِ توجہ ہیں:۔

خیز کہ بنمائمت مملکتِ تازۂ | چشمِ جہاں ہیں کشا، بہرِ تماشا خرام
قطرہ بے مایۂ، گوہرِ تابندہ شو | از سرِ گردوں بیفت، گیر بدریا مقام

چوتھے حصے میں آدم کے بہشت سے باہر آنے کے بعد کے تاثرات پیش کیے گئے ہیں۔ آدم یوں نغمہ سرا ہوتا ہے:۔

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دل کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن
ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے
رہ آسماں نوردن بہ ستارہ راز کردن!

پانچویں حصے میں صبحِ قیامت کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ آدم حضورِ باری تعالیٰ میں اپنے کارہائے نمایاں یا تسخیرِ فطرت کے لئے اپنی کوششوں کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

رشتۂ ہنرہائے من بحر بیک نائے آب | تیشۂ من آورد از جگرِ خارہ شیر
زہرہ گرفتارِ من، ماہ پرستارِ من | عقلِ کلاں کارِ من بہرِ جہاں داردیگر
من بہ زمیں در شدم، من بہ فلک بر شدم | بستۂ جادوئے من ذرہ و مہرِ منیر
گرچہ فسونش مرا برد ز راہِ صواب | از غلطم درگذر عذرِ گناہم پذیر
رام نگردد جہاں تا نہ فسونش خوریم | جز بکمندِ نیاز ناز نہ گردد اسیر

اس نظم کے علاوہ اقبال کی دو اور نظمیں ایسی ہیں، جن میں ان انسانی کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو انسان نے تسخیرِ فطرت کے سلسلہ میں اب تک کی ہیں۔ ایک نظم کا عنوان ''سرگذشتِ آدم'' ہے اور یہ نظم بانگِ درا کے پہلے حصے میں شامل ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔ حضرت آدم اپنی

سرگذشت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

رہی حقیقت عالم کی جستجو مجھ کو — دکھایا اوج خیال فلک نشیں میں نے
بنایا ذروں کی ترکیب سے کبھی عالم — خلاف معنی تعلیم اہل دین میں نے
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر — لگا کے آئینہ عقل دوربیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں کو برق مضطر کو — بنا دی غیرت جنت یہ سرزمیں میں نے

دوسری نظم "محاورہ مابین خدا و انسان" ہے۔ جو پیام مشرق میں شامل ہے۔ اس نظم میں انسان اپنے کارنامے خدا کے حضور میں اس طرح بیان کرتا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اس رنگ میں کہے گئے اقبال کے دو شعر بھی داد طلب ہیں:۔

قصور وار و غریب الدیار ہوں لیکن — ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
جہاں از آفرید ایں خوب تر ساخت — مگر با ایزد انباز است آدم

اختتام پر اقبال کی ایک ایسی غزل کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ جن میں ان لوگوں کے خد و خال نمایاں کیے گئے ہیں۔ جو تسخیر فطرت کے لئے کوشش کرتے ہیں:۔

قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند — ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اند و کمند بہ مہر و ماہ پیچند — بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند
بروز بزم سراپا چو پرنیان و حریر — بروز رزم خود آگاہ و تن فراموشند
نظام تازہ بچرخ دو رنگ می بخشند — ستارہ ہائے کہن را جنازہ بردوشند

اقبال کی اپنی نظر میں کلامِ اقبال

بالعموم ہر شاعر کی اپنے کلام کے متعلق اپنی بھی ایک رائے ہوتی ہے اور وہ اپنے اسلوبِ شعر گوئی کی نمایاں صفات سے آگاہ ہوتا ہے جس کا اظہار وہ کبھی وضاحت کے ساتھ اور کبھی اختصار کی صورت میں اپنے کلام یا کسی تحریر میں کرتا ہے۔ ایسی آرا کبھی شاعرانہ تعلّی کا درجہ رکھتی ہے اور کبھی عجز و انکسار کی غماز ہوتی ہیں۔ بعض صورتوں میں حقیقی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔ بہر صورت شاعر کی اپنے کلام کے متعلق اپنی کہی ہوئی باتیں دوسروں کے لئے قابلِ توجہ اور قابلِ قدر ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کی روشنی میں شاعر کے نظریات سے آگاہی حاصل کرتے اور اس کا کلام سمجھنے جانچنے اور پرکھنے میں کسی حد تک سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً میر کے جب یہ شعر پڑھے جائیں ؎

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ابہام بھی نہیں
مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

یا غالب کے ان اشعار پر نظر پڑے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل!

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعر نغز گو و خوش گفتار
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اب حالی کے یہ شعر دیکھنے میں آئیں۔

سُر بھی وہی اور تال وہی، پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر جان ہمیں

اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامہ مدح و غزل

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دوکاں سب سے الگ

تو مِیر، غالب اور حالی کے نظریات اور کلام کے کئی پہلو ہمارے سامنے بے نقاب ہو جاتے ہیں اور تعلیم و تنقید کی راہ میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اگر ہم اقبال کی شاعری کے متعلق ان کے اپنے تاثرات اور رجحانات سے آشنا ہونا چاہیں تو ہمیں ان کے خیالات ان کے بعض خطوط و مضامین اور اشعار میں منتشر صورت میں مل جاتے ہیں۔ کلام اقبال کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسے فن کار کی طرح شاعری کے میدان میں قدم

رہا۔ جو اپنے فن کے تقاضوں سے باخبر اور اپنے زمانے اور ماحول کا نبض شناس ہو۔ شاعر کے لئے چونکہ وسیلۂ اظہار زبان ہوتی ہے۔ اس لئے زبان پر قدرت حاصل کرنا اور موزوں الفاظ منتخب کرنا ایسے مشکل مراحل ہیں، جن سے شاعر کو گزرنا پڑتا ہے۔ شاعر اگر اہلِ زبان نہ ہو تو زبان کا مسئلہ اور بھی مشکل اور اہم بن جاتا ہے۔ اقبال کو اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اور انہوں نے زمانہ طالبعلمی میں ہی اپنے طرزِ عمل کا اظہار ان الفاظ میں کر دیا ؎

اقبال لکھنؤ سے نہ دل سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

دہلی اور لکھنؤ سے بے تعلق ہونے کا اعلان کرنے کی اقبال کو اس لئے ضرورت پڑی کہ ہندوستان کی جس ادبی فضا میں انہوں نے ہوش سنبھالا وہ لکھنوی طرزِ نگارش اور دہلوی انداز میں بٹ چکی تھی یتذکیر و تانیث واحد و جمع اور روزمرہ محاورہ سے لے کر مضامین و مطالب کے انتخاب تک لکھنویوں اور دہلویوں میں اختلاف تھا۔ لاہور کے رہنے والوں کی زبان اہلِ زبان نہ ہونے کی وجہ سے مستند نہیں سمجھی جاتی تھی بیسویں صدی کے آغاز میں جب لاہور کے ادبی حلقوں میں اقبال کی شاعری کا چرچا ہوا اور ان کا کلام شائع ہونے لگا۔ تو اقبال کی زبان پر تنقید شروع ہو گئی جس کے جواب میں اقبال نے محولہ بالا شعر کہا اور اکتوبر ۱۹۰۵ء میں ایک مضمون بعنوان "اردو زبان پنجاب میں" رسالہ "مخزن" میں شائع کیا۔ اس مضمون کی چند سطور درج ذیل ہیں :-

"جو زبان ابھی بن رہی ہو۔ اور جس کے محاورات و الفاظ جدید ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً اختراع کئے جا رہے ہوں۔ اس کے

محاورات کی صحت و عدم صحت کا معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے
ابھی کل کی بات ہے۔ اردو زبان جامع مسجد کی سیڑھیوں تک محدود تھی۔ مگر
چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا۔ اس واسطے اس
بولی نے ہندوستان کے دیگر صوبوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا۔ اور کیا تعجب
ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیر نگیں ہو جائے۔ ایسی صورت
میں ممکن نہیں کہ جہاں وہاں اس کا رواج ہو، وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت ان
کے تمدنی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر اثر کئے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ
ایک مسلمہ اصول ہے جس کی صداقت اور صحت زبانوں کی تاریخ سے واضح
ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے۔ کہ اس
اصول کے عمل کو روک سکے۔ تعجب ہے کہ میز، کمرہ۔ کچہری، نیلام وغیرہ اور
فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے بلا تکلف استعمال کرو۔ لیکن
اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پر
معنی پنجابی لفظ استعمال کرے تو اسے کفر و شرک کا مرتکب سمجھو اور باتوں کا ...
اختلاف ہو تو ہو گا۔ یہ مذہب مقصود ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن پنجابی کا کوئی
لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے۔ یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں
کی صریح مخالف ہے۔ اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فرد بشر کے امکان میں نہیں
ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے۔ جس سے اردو الفاظ و محاورات
اخذ کرے تو آپ کا عذر بے جا ہو گا۔ اردو ابھی کب ال کی علمی زبان بن چکی
ہے جس سے انگریزی نے کئی ایک الفاظ بدمعاش۔ بازار۔ لوٹ۔ چالاک
وغیرہ کے لئے ہیں۔ اور ابھی روز بروز لے رہی ہے۔

اگر دو زبان کے دامن کو وسعت بخشنے کے لئے یہ مشورہ اگرچہ آج

سے تقریباً ساٹھ سال پہلے اقبال نے دیا تھا۔ مگر مرورِ ایام اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ آج بھی اردو زبان کی ترقی کے جو لوگ خواہاں ہیں۔ ان کے لئے یہ مشورہ مشعلِ راہ بن کر سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔ زبان کے سلسلہ میں ہی شاعر کے سامنے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس جذبے یا خیال کا اظہار یا ابلاغ مقصود ہے۔ شاعر اسے زبان کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دے یا کم یا مواد اور ہیئت کو یکساں صورت میں اہم سمجھے جیسے کہ حالی نے اپنے اس شعر میں کہا ہے ؎

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی

اقبال اس مسئلے کو اس طرح حل کرتے ہیں کہ مطالب و معانی کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ اور زبان و ہیئت کو ثانوی۔ اقبال نے شعر کہتے ہوئے یہی اصول اپنے سامنے رکھا۔ اس حقیقت کا اظہار حکیم احمد شجاع کے نام ایک خط میں انہوں نے ان الفاظ کیا ہے۔ "میرے زیرِ نظر حقائق اخلاقی و ملی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ فنِ شعر سے بھی نابلد ہوں، ایک دوسرے خط میں سید سلیمان ندوی کو بھی انہوں نے یہی بات ان الفاظ میں لکھی ہے۔ "میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے یہ نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست   کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

زبان کے مقابلے میں معانی کی طرف زیادہ توجہ دینے کا اظہار اقبال

نے ان اشعار میں بھی کیا ہے۔

نہ زباں کوئی غزل کی نہ غزل سے آشنا ہیں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

اقبال شاعر ہوتے ہوئے صرف انکار ہی نہیں کرتے بلکہ ان لوگوں کے متعلق شکایت کرتے ہیں جو انہیں صرف شاعر سمجھتے ہیں اور ان کے پیام کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

نہ شاخِ نخل من خرما نخوروند	یاراں نہ کہ گفتم پے نبردند
مرا یاراں غزل خوانے شمردند	من اے میر امم ، داد از تو خواہم

دراصل اقبال جب غزل گو ہونے سے انکار اور غزل کی زبان سے ناواقفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ تو ان کے ذہن میں ناسخ و آتش اور داغ کی شاعری و زبان ہوتی ہے جس کا ان کے زمانے میں چرچا تھا۔ اور جس میں محاورات اور صنائع لفظی و بدائع معنوی کا سہارا بکثرت لیا جاتا تھا۔ اقبال اپنی غزلوں میں ایسا کوئی لفظ، کوئی ترکیب کوئی استعارہ نہیں لاتے جس سے کسی قسم کے مصنوعی پن کا اظہار ہو۔ وہ فارسی اور عربی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ، تراکیب اور ... تشبیہات اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ وہ اردو زبان کے مانوس جز معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے کلام میں فنی محاسن اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی روشنی میں ان کا فن سے بے خبر اور شعریت سے بیگانہ ہونے کا اعلان ان کی طبیعت کی انکساری کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔ یہ خیال اقبال کے ان اشعار کی موجودگی میں اور بھی پختہ ہو جاتا ہے۔ جن میں انہوں نے اپنے اشعار کی دلکشی اور تاثیر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بطور مثال چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی	کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا

نکلی تو لب اقبال سے ہے کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغام سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی۔

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے!
گفتار کا غازی بن تو گیا، کردار کا غازی بن نہ سکا

ز شعر دلکش اقبال می تواں دریافت
کہ درسِ فلسفہ می داد و عاشقی ورزید

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن افروخت
عرب ز نغمہ شوقم ہنوز بے خبر است

اقبال کو کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ میں مسلمانوں کو جو پیغام دے رہا ہوں۔ شاید وہ اسے قبول نہ کریں اور ماضی کی ایک کہانی سمجھیں ے

سنے گا اقبال کون ان کو، یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

ہیں کہ میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ!
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

لیکن اپنے پیغام کی افادیت کا اقبال کو یقین ہے۔ وہ کہتے ہیں ے

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اقبال حقیقت کو رمز و کنایہ کے سہارے پیش کرنا اچھا سمجھتے ہیں۔

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائیست!
حدیث خلوتیاں جز بہ رمز وایما نیست

مگر بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ عروس معنی کو لاکھ پردوں میں چھپایا جائے وہ نہیں چھپتی اقبال ایسی ہی صورت حال کی طرف اپنے ان اشعار میں اشارہ کرتے ہیں ؎

بلب رسید مرا آں سخن کہ نتواں گفت
بحیرتم کہ فقیہان شہر خاموشند
بکسے عیاں نہ کردم ز کسے نہاں نہ کردم
غزل آنچناں سرودم کہ برون فتاد رازم
در غزل اقبال احوال خودی را فاش گفت
زانکہ ایں نو کافر آئین دیر آگاہ نیست

اقبال حقیقت کو مجاز کے پردے میں اور رمز و کنایہ کے سہارے اس لیے پیش کرتے ہیں کہ ماحول سازگار نہیں اور ملک میں ہم خیال انسان کمیاب ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں ؎

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

اس چمن میں مرغ دل گائے نہ آزادی کے گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے

ذوق گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینہ سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

اقبال کی عظمت اس میں ہے کہ وہ ماحول کے ناخوشگوار ہونے کا اثر بالکل عارضی صورت میں قبول کرتے ہیں اور مایوس ہو کر خاموش نہیں ہو جاتے بلکہ ماحول بدلنے کا نعرہ لگاتے ہیں اور غافل اہل وطن یا مسلمانوں

کی بے حسی دور کرنے کے لئے یوں حدی خواں ہوتے ہیں:۔

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے ۔۔۔ خرمنِ باطل جلا دے شعلہ آواز سے

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو ۔۔۔ جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

ان اشعار کا تعلق اقبال کی زندگی کے پہلے دور سے ہے۔ حالات بدلنے، مطالعہ وسیع ہونے نئے نئے تجربات اور مشاہدات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ شاعری سے پیمبری کی طرف قدم بڑھاتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کا پیام قرآنی افکار کا ترجمان بن گیا۔ دوسرے (۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک) اور تیسرے (۱۹۰۸ء سے لے کر سالِ وفات تک) دور میں اقبال اپنی منزل کی نشاندہی ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے
تجھ کو خبر نہیں ہے کیا بزمِ کہن بدل گئی!
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے میری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

بیا کہ من ز خمِ پیرِ روم آوردم !!!
مے سخن کہ جوان تر ز بادۂ عنبی است

گوہر دریائے قرآن سفتہ ام
شرح رمز صبغتہ اللہ گفتہ ام

اپنی شراب مضمون کو اقبال نے "عجمی خم" میں کیوں پیش کیا۔ اس سوال کا جواب وہ خود اسرار خودی میں اس طرح دیتے ہیں :۔

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است ۔ طرز گفتار دری شیریں تر است
فکر من از جلوہ اش مسحور گشت ۔ خامۂ من شاخ نخل طور گشت
پارسی از رفعت اندیشہ ام ۔ در خورد با فطرت اندیشہ ام

خردہ بر مینا مگیر اے ہوشمند
دل بذوق خردہ مینا بہ بند

کلام اقبال میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن سے اقبال کا اپنے کلام سے لگاؤ ظاہر ہوتا ہے اور جو ان کے دل کی واردات کے عکاس ہیں۔ مثلاً حسب ذیل اشعار :۔

جبرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھکو
میرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں
ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے
سینۂ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے
غزلے زدم کہ شاید بنوا قرارم آید
تپ شعلہ کم نگردد ز گسستن شرارہ

آخر میں اقبال کے ان اشعار کو پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے کہے تھے اور جن میں وہ اپنے آپ کو "فقیر" اور "دانائے راز" کہتے ہیں :۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید،
نسیمے از حجاز آید کہ ناید،
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

حقیقت یہ ہے کہ وہ اقبال جو زمانہ طالب علمی سے لے کر سفر آخرت کے وقت تک اپنے آپ کو شاعر کہلانے سے گریز کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد اردو شاعری کو ان جیسا "دانائے راز" اب تک ملا نہیں ہے مستقبل کا حال خدا جانے۔

علامہ اقبال کی اردو نثر

اکثر یہ ہوتا ہے کہ جامع الحیثیات شخصیتوں کے جملہ پہلوؤں پر کما حقہ توجہ نہیں دی جاتی اور ان کا جو پہلو شہرت حاصل کر لیتا ہے وہ دوسرے پہلوؤں کو ابھرنے نہیں دیتا علامہ اقبال کے سلسلہ میں بھی یہی ہوا ہے وہ اندرون ملک اور بیرون ملک شاعر کی حیثیت سے جو غیر معمولی صورت میں مشہور ہوئے تو نثر نگار کی صورت میں انہیں بہت کم لوگوں نے جانا پہچانا۔ حالانکہ اگر ان کی تحریروں کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ اگر ان سے شعری سرمایہ چھین بھی لیا جائے تو اس کا نثری سرمایہ علمی اور ادبی دنیا میں شہرت عام اور بقائے دوام کا ضامن ہے۔

علامہ کے متعلق اب تک جو کتابیں اور مضامین شائع ہوئے ہیں ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس تصنیف کی بدولت پہلی بار مصنفین کی صف میں شامل ہوئے وہ علم الاقتصاد ہے جو معاشیات کے موضوع پر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی اور نایاب ہے۔ مکاتیب اقبال بنام عطیہ فیضی سے معلوم ہوتا ہے کہ علم الاقتصاد کا اصل مسودہ علامہ نے اپنی ہمعصر دوست خاتون عطیہ فیضی کو دیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ مسودہ اب بھی اس فاضل خاتون کے نوادر میں شامل ہو۔ یہ کتاب اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کی زبان اس دور کے ایک صاحب طرز

ادیب مولانا شبلی نے درست کی تھی۔ علامہ خود اس تصنیف کے دیباچے میں لکھتے ہیں ہو، مخدوم و محترم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مد ظلہ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر صلاح دی۔ "اس سلسلہ میں اس حقیقت کا اظہار دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ بی۔ اے میں علامہ کے مضامین انگریزی فلسفہ اور عربی تھے۔ ایم۔ اے انہوں نے فلسفہ میں کیا تھا۔ ممکن ہے کہ اقتصادیات کا مطالعہ ایف اے میں کیا ہو۔ اس طرح ایک ایسے مضمون میں جس میں درسی مطالعہ بالکل نہ ہو یا ایف اے کی سطح تک ہو صاحب تصنیف ہونا یقیناً غیر معمولی بات ہے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے ایک ماہر تبض شناس دوراں کی حیثیت میں وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اقتصادیات کے موضوع پر قلم اٹھایا۔

ماہر اقتصادیات

مولانا حالی کے سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ سرسید نے اردو غزل پر یہ ظلم کیا کہ حالی کو اصلاحی اور اخلاقی شعر کہنے والا بنا دیا۔ اسی صورت میں اگر میں یہ کہوں کہ پروفیسر آرنلڈ اور سر عبد القادر نے علامہ کو تمام تر توجہ شاعری کی طرف مبذول کرنے کا مشورہ دے کر علم اقتصادیات پر ظلم کیا تھا تو نامناسب نہیں ہوگا کیونکہ علم الاقتصاد میں اخذ و ترجمہ کے علاوہ انفرادی غور و فکر کی بھی ایسی راہیں ملتی ہیں کہ جن پر علامہ اگر بعد کی زندگی میں بھی گامزن رہتے۔ تو یقیناً ایک ماہر اقتصادیات کی حیثیت سے شہرت حاصل کرتے۔ علم اقتصاد کے پیش نظر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ علامہ نے اپنے کلام میں معاشیات کے جو مطالب پیش کئے ہیں۔ اور کارل مارکس اور اشتراکیت کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ صرف ایک شاعر کی باتیں نہیں ہیں بلکہ ایک فن شناس کی فنی آرا ہیں۔

ادب پارے

علم الاقتصاد کے علاوہ علامہ نے اُردو نثر میں جو ادب پارے اپنی یادگار چھوڑے ہیں وہ مضامین خطوط تقاریر اور چند دیباچوں سے عبارت ہیں مضمون نگاری کا سلسلہ انہوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی شروع کر دیا تھا۔ ان کا پہلا اہم مضمون "بچوں کی تعلیم و تربیت" سے متعلق ہے جو جنوری ۱۹۰۲ء میں "مخزن" لاہور میں شائع ہوا تھا۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود اس مضمون کی معلم سے متعلق مندرجہ ذیل سطور آج بھی ارباب اختیار کی توجہ کی طالب ہیں معلم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا انہیں کی قدرت میں ہے۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجے کی محنت اور سب کارگزاریوں سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری معلم کی کارگزاری ہے۔ اگرچہ بدقسمتی سے اس ملک میں اس مبارک پیشے کی وہ قدر نہیں جو ہونی چاہیے۔ معلم کا فرض تمام فرضوں سے زیادہ مشکل اور اہم ہے کیونکہ تمام قسم کی اخلاقی، تمدنی اور مذہبی نیکیوں کی کلید اسی کے ہاتھ میں ہے اور تمام قسم کی ملکی ترقی کا سرچشمہ اسی کی محنت ہے۔

لسانیات

اس مضمون کے بعد اکتوبر ۱۹۰۳ء میں "مخزن" میں شائع ہونے والے علامہ کے ایک دوسرے مضمون بعنوان "اُردو زبان پنجاب میں" کو بہت شہرت حاصل ہوئی اس مضمون میں انہوں نے ایسے بصیرت افروز خیالات پیش کیے ہیں کہ آج بھی ان کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے ایک ماہر لسانیات کی طرح اس مضمون میں وہ فرماتے ہیں۔ "ابھی کل کی بات ہے۔ اُردو زبان جامع مسجد کی سیڑھیوں تک محدود تھی مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا

اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیر نگیں ہو جائے۔ ایسی صورت میں ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت، ان کے تمدنی حالات اور ان کے طرز بیان کا اس پر اثر نہ ہوا ہو۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے۔ تعجب ہے کہ میز، کمرہ، کچہری، نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے تو بلا تکلف استعمال کرو لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا پرمعنی پنجابی لفظ استعمال کرے تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو گا یہ مذہب منصوص ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن یعنی پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے۔ یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں کے صریح مخالف ہے اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فرد بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے۔ جس سے اردو الفاظ و محاورات اخذ کرتے تو آپ کا عذر بے جا ہو گا۔ اردو ہی ابھی کہاں کی علمی زبان بن چکی ہے جس سے انگریزی نے کئی ایک الفاظ بد معاش، بازار، لوٹ، چالان وغیرہ کے لئے ہیں اور ابھی روز بروز لے رہی ہے "

قلمی جنگ

علامہ کی زندگی کے آخری ایام میں مولانا حسین احمد مدنی نے کہیں یہ فرمایا کہ اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، علامہ کو چونکہ تو میت کے اس تصور سے اختلاف تھا اس لئے دونوں بزرگوں میں قلمی جنگ شروع ہو گئی

اسلام اور قومیت کے عنوان سے روزنامہ "احسان" لاہور میں ۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو علامہ کا جو مضمون شائع ہوا تھا وہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس مضمون میں علامہ کے جواب دعویٰ کا رنگ اور آہنگ ان سطور میں ملاحظہ کیجیے۔

• مولانا نے یہ فرض کر کے کہ مجھے قوم اور ملت کے معانی میں فرق معلوم نہیں اور شعر لکھنے سے پہلے جہاں میں نے مولانا کی تقریر کی اخباری رپورٹ کی تحقیق نہ کی وہاں قاموس کی ورق گردانی بھی نہ کر سکا مجھے زبان عربی سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ یہ طعنہ سر آنکھوں پر لیکن کیا اچھا ہوتا اگر میری خاطر نہیں عامتہ المسلمین کی خاطر قاموس سے گزر کر قرآن حکیم کی طرف مولانا رجوع کر لیتے اور اس خطرناک اور غیر اسلامی نظریے کو مسلمان کے سامنے رکھنے سے پیشتر خدائے پاک کی نازل کردہ مقدس وحی سے بھی استشہاد فرماتے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں عالم دین نہیں نہ عربی زبان کا ادیب ہے

قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا

فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

لیکن آپ کو کونسی چیز مانع آئی کہ آپ نے صرف قاموس پر اکتفاد کیا۔ کیا قرآن پاک میں سینکڑوں جگہ لفظ قوم استعمال نہیں ہوا کیا قرآن میں ملت کا لفظ متعدد بار نہیں آیا۔ آیات قرآن میں قوم و ملت سے کیا مراد ہے۔"

علامہ کے ان مضامین کے علاوہ تین دوسرے مضامین کا علمی اور ادبی دنیا میں چرچا عام ہوا۔ تصوف خودی اور قومیت کے متعلق امرتسر کے مشہور وکیل اخبار، مولوی ظفر علی خاں کے اخبار "ستارہ ہند" جلالپور جٹاں کے مشہور اخبار

صوفی ، روزنامہ "زمیندار" لاہور اور روزنامہ "احسان" لاہور میں چھپنے والے متعدد مضامین میں بعض حرف اقبال، آثارِ اقبال اور مضامین اقبال میں شامل ہو چکے ہیں لیکن بعض ابھی تک اوراق پریشان کی صورت میں ملتے ہیں۔

مکاتیب

جس طرح مطالب کے اعتبار سے علامہ کے مضامین قابلِ قدر ہیں، اسی طرح ان کے مکاتیب بھی گرانقدر ہیں۔ بالخصوص وہ دو مجموعے جو "اقبالنامہ" کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کو شیخ عطاء اللہ ایم اے نے مرتب کیا تھا۔ پہلے مجموعہ میں ۲۶۷ اور دوسرے مجموعہ میں ۱۸۷ مکاتیب شامل ہیں۔ ان مکاتیب میں سے جو مکاتیب اکبر الہ آبادی، خواجہ حسن نظامی، سید سلیمان ندوی، سراج الدین پال اور عبداللہ چغتائی کے نام ہیں، موضوعات اور زبان کے اعتبار سے بہت بلند پایہ ہیں۔ ان مجموعوں میں جو سب سے پرانا خط ملتا ہے وہ ۲۸، فروری ۱۸۹۹ء کو گورنمنٹ کالج لاہور کے بورڈنگ ہاؤس سے مولانا احسن مارہروی کے نام لکھا گیا ہے۔ اس خط میں علامہ کی زمانہ طالب علمی کی ایک دلچسپی کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ یہ خط اس عقیدت کا مظہر ہے جو علامہ کو نواب مرزا داغ سے تھی۔ علامہ اس خط میں لکھتے ہیں۔ "دونوں رسالے پہنچے، سبحان اللہ نواب صاحب کی غزل کیا مزے کی ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک میں نے آپ کے گلدستے کو کوئی غزل نہیں دی۔ انشاء اللہ تعالیٰ امتحان کے بعد باقاعدہ ارسال کیا کروں گا۔ ایک تکلیف دیتا ہوں فوٹو کے لئے امریکہ لکھا ہے غالباً کسی نہ کسی استاد بھائی کے پاس تو حضرت کا فوٹو ضرور ہو گا اگر آپ کو معلوم ہو تو ازراہ عنایت جلد مطلع فرمایئے حضرت امیر مینائی کے فوٹو کی بھی ضرورت ہے۔"

زندگی کے آخری دور میں خطوط نویسی کی جو صورت تھی، اس کا اندازہ

۱۹۳۵ء میں سید سلیمان ندوی کے نام لکھے گئے ایک خط کی ان سطور سے بخوبی ہو سکتا ہے، جیسا کہ تحریر ہے: "میں نے ابھی چاہتا ہوں تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن سے متعلق اپنے خیالات قلمبند کر جاؤں، جو تھوڑی سی ہمت اور طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے اسے اس خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ (قیامت کے دن) آپ کے جد امجد (حضور نبی کریم) کی زیارت مجھے اس اطمینان خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضور نے ہم تک پہنچایا کوئی خدمت بجا لا سکوں۔"

اپنی تصانیف اسرار خودی، رموز خودی اور پیام مشرق کے دیباچوں کے علاوہ بعض دوسرے مصنفین کی کتابوں کے متعلق بھی علامہ کی آراء علامہ کی اردو نثر کا جائزہ لینے کے سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔ مثلاً رضا علی وحشت کے کلام کے متعلق ان کی رائے وحشت کے کلام کے دوسرے ایڈیشن میں بصورت اشتہار شامل ہے اسی طرح ۱۹۱۵ء میں جب منشی پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ پریم پردیسی شائع ہوا تو علامہ نے اس مجموعہ کے متعلق جو رائے دی وہ اس کتاب کے ایک اشتہار مطبوعہ الفاظ، لکھنؤ ستمبر ۱۹۱۵ء میں بدیں صورت شائع ہوئی۔ "آپ نے اس کتاب کی اشاعت سے اردو لٹریچر میں ایک نہایت قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نتیجہ خیز افسانے جدید لٹریچر کی اختراع ہیں۔ میرے خیال میں آپ پہلے شخص ہیں جس نے اس دقیق راز کو سمجھا ہے اور سمجھ کر اس سے اہل ملک کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ان ... کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف انسانی فطرت کے اسرار سے خوب واقف ہے اور اپنے مشاہدات کو ایک دلکش انداز میں ادا کر سکتا ہے۔"

بیسویں صدی عیسوی کے ربع ثانی میں مشرقی اقوام میں بیداری کی لہر نے جنم لیا تھا۔ اس کی طرف علامہ پیام مشرق کے دیباچہ میں اس طرح اشارہ کرتے ہیں:
مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی

ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔"

علامہ کی چند تقاریر بھی حرف اقبال، آثار اقبال اور ملفوظات اقبال میں ملتی ہیں ان تقاریر کی اہمیت دوگونہ ہے ایک تو اس لئے کہ ان میں برصغیر پاک و ہند کے بیسویں صدی عیسوی کے پہلے چالیس سالوں کے سیاسی، سماجی اور علمی مسائل کے متعلق گرانقدر معلومات ملتی ہیں ان تقاریر میں سے بیشتر علامہ نے بحیثیت رکن مجلس قانون ساز پنجاب، مجلس قانون ساز کے مختلف جلسوں میں کی تھیں۔

مجموعی صورت میں علامہ کی نثر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نثر کی حیثیت ثانوی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کی طرف غیر معمولی توجہ ہونے کی وجہ سے علامہ کو نثر لکھنے کا اتفاق ہی شاذ و نادر ہوتا تھا اس کے علاوہ مضامین خطوط اور دیباچوں کا غالب حصہ بھی شاعری ہی کی بدولت معرض وجود میں آیا ہے ان نثر پاروں میں انہوں نے کہیں اپنے کلام سے متعلق دوسروں سے استفسارات کئے ہیں اور کہیں دوسروں کے اعتراضات اور سوالات کے خود جواب دیئے ہیں۔ چند مسائل کی تشریح ان نثر پاروں کا امتیازی نشان ہے۔

ان حقائق کی بنا پر یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کے کلام کو سمجھنے کے لئے ان کی نثر کا مطالعہ ناگزیر ہے کیونکہ بہت سے الجھے ہوئے مسائل جو اشعار میں وضاحت طلب تھے نثر میں نہایت واضح الفاظ میں پیش کر دئے گئے ہیں۔

اقبال اور کشمیر

مسلم اکثریت والے جو علاقے یا ممالک اکثر علامہ اقبال کی توجہ کا مرکز بنے رہے اور جن کے سیاسی اور سماجی حالات میں وہ اپنے نظریات کے مطابق انقلاب کے خواہاں رہے۔ کشمیر کا خطہ جنت نظیر ان علاقوں میں سے ایک۔ کشمیر اور اہل کشمیر سے علامہ کی دلچسپی، ان کے مکتوبات و خطبات سے بھی واضح ہے۔ اور ان کے کلام سے بھی۔ اس دلچسپی کی کئی وجوہ ہیں۔ جن میں سے پہلی یہ ہے کہ علامہ کا تعلق چونکہ کشمیری تھے۔ لہٰذا لامحالہ انہیں اپنے آبائی وطن سے محبت تھی۔ دوسرے یہ کہ کشمیر کے دل فریب مناظر حسن کے متلاشی اور حسن نواز شاعر کے لیے اپنے اندر ایک کشش رکھتے تھے۔ تیسری یہ کہ غنی کاشیری جیسے قادر الکلام شاعر سے اقبال کو جو عقیدت تھی وہ بھی انہیں کشمیر کی طرف مائل کئے ہوئے تھی۔ چوتھی یہ کہ کشمیر میں علامہ کے بعض ایسے دوست موجود تھے جن کی وجہ خاندان سے تھا اور ان کے آباؤ اجداد کشمیری تھے۔ مثلاً غلام السیدین۔ پانچویں اور اہم وجہ جو ایک حد تک جملہ وابستگیوں کا نتیجہ تھی ڈوگرہ استبداد کی وجہ سے پیدا شدہ کشمیری مسلمانوں کی زبوں حالی تھی۔ اس صورت حال سے علامہ اس قدر متاثر ہوئے کہ کشمیر کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے کشمیریوں کے سیاسی اور سماجی مسائل میں دلچسپی لینے لگے۔

سیاسیات کشمیر میں دلچسپی

آخری وجہ کا واضح صورت میں اظہار ان کے خطبات اور مکتوبات میں موجود ہے خطبات "حرفِ اقبال" میں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ المینار اکیڈمی لاہور کی طرف سے شائع ہو چکا ہے اور مکتوبات ان دو مجموعوں میں شامل ہیں۔ جو شیخ عطار اللہ پرنسپل اسلامیہ کالج چنیوٹ نے مرتب کئے ہیں۔ محولہ مکتوبات میں سے وہ خطوط اہم ہیں جو شیخ عبداللہ، سید نعیم الحق اور ظہور الدین مجھور نے نام لکھے گئے ہیں۔

سید نعیم الحق پٹنہ میں وکیل تھے اور علامہ نے ان کو ڈوگرہ راج کے خلاف پرچم بلند کرنیوالوں کے مقدمات کی پیروی کرنے کے لئے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۲ء میں خود خط لکھ کر جموں اور کشمیر آنے کی دعوت دی تھی۔ اس سلسلہ میں ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو سید نعیم الحق کے نام جو خط لکھا گیا اس کا حوالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ خط انگریزی میں تھا۔ شیخ عطاء اللہ کا ترجمہ شدہ خط پیش کیا جاتا ہے۔

"نوازش نامہ موصول ہوا جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ اگر میں کانفرس میں شرکت کے لئے پٹنہ آسکا۔ تو یقیناً آپ سے ملاقات میرے لئے باعث مسرت ہو گی۔ لیکن پٹنہ میں میرا آنا غیر یقینی ہے۔ کیونکہ مجھے ممکن ہے۔ اواخر مارچ ۱۹۳۴ء میں آکسفورڈ میں لیکچر دن کے ایک سلسلے کے لئے انگلستان جانا پڑے اور یہ ضروری ہے کہ یہ لیکچر میری روانگی سے پیشتر مرتب کر لئے جائیں۔ اگر میرا ارادہ پٹنہ آنے کا ہوا تو آپ کو مطلع کر دوں گا۔ کشمیر کے مسلمانوں کی امداد و اعانت آپ کا بڑا ہی کرم ہے۔ مقدمات کی تاریخیں فروری ۳۴ میں حسب ذیل ہیں:۔

۵ سے ۱۰ فروری تک مقدمہ سکھ چین پور ۱۴ فروری تک مقدمہ علی بیگ۔ دونوں مقدمات کی سماعت جموں میں ہو گی۔ کیا آپ دونوں مقدمات کی

برادری کے لئے تیار رہیں۔ ملک برکت علی فروری میں اپنے انتخاب میں مصروف ہوں گے ہم سب آپ کی بحمد تہ اعانت کے لئے نہایت احسانمند ہوں گے۔ اگر آپ کلیف گوارا فرمائیں گے تو مجھے فوراً بذریعہ تار اپنی آمادگی سے مطلع فرمائیں تاکہ ضروری کاغذات بھیج سکوں کوشش کروں گا کہ آپ کے لئے ایک مددگار مہیا کیا جائے۔ عبدالمجید صاحب نے مجھے اطلاع دی ہے کہ آپ نے ذکر کیا تھا کہ پٹنہ کے عبدالعزیز صاحب مسلمانوں کی امداد کو ہر وقت تیار رہوں گے۔ آپ میری طرف سے ان کی خدمت میں کشمیر کے بے بس مسلمانوں کی امداد کی درخواست کیجئے مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالےٰ آپ کو جزائے خیر دے گا۔ آپ کے تار کا انتظار رہے گا۔

مخلص: محمد اقبال

شیخ عبداللہ کے نام خط

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں مسلم کانفرنس کشمیر کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی تو شیخ عبداللہ کے نام خط میں اس طرح سے معذرت کی گئی:

آپ کا والانامہ ابھی ملا ہے۔ مسلم کانفرنس کشمیر کے اخبار پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ بندگانِ کشمیر بہت جلد اپنے معاملات سلجھا سکیں گے۔ اس بات کے لئے میں ہر لحظہ دست بدعا ہوں۔ اور یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ اپنے فضل و کرم سے آپ کی مساعی کو بارآور کرے گا۔ لیکن جو مختلف جماعتیں سنا ہے کہ بن گئی ہیں۔ ان کا باہمی اختلاف آپ کے مقاصد کی تکمیل میں بہت بڑی رکاوٹ ہو گا۔ ہم آہنگی میں ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی و تمدنی مشکلات کا علاج ہے۔ ہندو کے

مسلمانوں کے کام اب تک محض اس وجہ سے بگڑ رہے ہیں کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہو سکی۔ اور اس کے افراد اور بالخصوص علماء اوروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہے۔ بلکہ اس وقت ہیں۔ بہر حال دعا ہے کہ آپ کے ملک کو یہ تجربہ نہ ہو۔

افسوس ہے کہ میں اور مشاغل کی وجہ سے کانفرنس میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

محمد اقبال۔ لاہور

تذکرہ شعرائے کشمیر

کشمیر میں فارسی زبان کو مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں جو غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی اس کی وجہ سے علامہ کو جو کشمیر سے لگاؤ تھا۔ وہ اس مکتوب سے واضح ہے جو ظہور الدین مہجور کے نام بدیں الفاظ لکھا گیا۔

"مجھے یہ معلوم کر کے کمال مسرت ہوئی کہ آپ تذکرہ شعرائے کشمیر لکھنے والے ہیں۔ میں کئی سالوں سے اس کے لکھنے کی تحریک کر رہا ہوں۔ مگر افسوس کسی نے توجہ نہ کی۔ آپ کے ارادوں میں ... اللہ تعالیٰ برکت دے۔

افسوس ہے کہ کشمیر کا لٹریچر تباہ ہو گیا۔ اس تباہی کا باعث زیادہ تر سکھوں کی حکومت اور موجودہ حکومت کی لاپرواہی اور نیز مسلمانوں کی غفلت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وادی کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی موجودہ لٹریچر کی حفاظت کے لئے ایک سوسائٹی بنائیں۔ ہاں تذکرہ کشمیر لکھتے وقت شبلی کی شعرالعجم آپ کے پیش نظر رہنی چاہئے

محض حروفِ تہجی کی نسبت سے شعراء کا حال لکھ دینا کافی نہ ہو گا۔
کام کی چیز یہ ہے کہ آپ کشمیر میں فارسی شعر کی تاریخ لکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی تصنیف نہایت بارآور ثابت ہو گی۔ اگر کبھی خود کشمیر میں یونیورسٹی بن گئی تو فارسی زبان کے نصاب میں اس کا کورس ہونا یقینی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے!

امید ہے کہ جناب کا مزاج بخیر ہو گا۔ میرے پاس کوئی رسالہ تذکرۂ شعراء کے لئے نہیں ہے۔ ورنہ آپ کی خدمت میں ارسال کرتا۔ والسلام

محمد اقبال۔ لاہور

کشمیری مسلمان تقریباً تیس برس سے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ مگر ابھی تک ان کی کوششیں بارآور ثابت نہیں ہو سکی ہیں۔ اور کشمیر کی قسمت نہیں بدلی ہے ڈوگرہ راج قیامِ پاکستان سے قبل بدیشی حکمرانوں کی پناہ میں اور اس کے بعد بھارت سرکار کے سہارے کشمیریوں کو حق خود ارادیت سے محروم کئے ہوئے ہے۔ معلوم نہیں کہ علامہ کی وہ تمنا یا پیش گوئی کب پوری ہو گی جس کا حوالہ بالا خط میں اظہار کیا گیا ہے۔

کشمیر کلامِ اقبال میں

مسائلِ کشمیر میں علامہ کی گہری دلچسپی کا یہ انداز صرف ان کے مکتوبات تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کے کلام میں بھی موجود ہے۔ ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض، اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ بیاض کی تیسری نظم میں ڈوگرہ عہد کے مجبور و محکوم کشمیر کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں ؎

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر — کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک — مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستان بیدردیٔ ایام کی — کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ — ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

بیاض میں شامل نظموں میں علامہ کشمیریوں کی حالتِ زار پہ صرف آنسو ہی نہیں بہاتے ہیں بلکہ انہیں اپنے درد کا مداوا کرنے کے لئے رسمِ شبیری ادا کرنے کا درس بھی دیتے ہیں ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری — کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی — یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری
شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو — کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری
چہ بے پروا گذشتند از نوائے صبحگاہِ من — کہ برد آں شور و مستی از سیہ چشمانِ کشمیری

کشمیری مزدور خود محروم رہتے ہوئے امیروں کے آرام و آسائش کے لئے جس صورت میں سرگرمِ عمل ہوتا ہے۔ وہ علامہ سے پوشیدہ نہیں ہے فرماتے ہیں ؎

حاجت نہیں اے خطۂ گل شرح و بیاں کی — تصویر ہمارے دلِ پرخوں کی ہے لالہ
تقدیر ہے اک نام مکافاتِ عمل کا — دیتے ہیں یہ پیغام خدایانِ ہمالہ
سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا — دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ
امید نہ رکھ دولتِ دنیا سے وفا کی — رم اس کی طبیعت میں ہے مانندِ غزالہ

اہلِ کشمیر کے سیاسی اور سماجی مسائل کے علاوہ کشمیر کے دلفریب مناظر پر بھی اقبال کی توجہ رہی ہے۔ "پیامِ مشرق" میں شامل دو نظمیں "ساقی نامہ" اور "کشمیر" اس دعوے کا بین ثبوت ہیں۔ ساقی نامہ نشاط باغ کشمیر میں لکھا گیا۔ اقبال نے اس نظم میں نشاط باغ کی پر لطف اور دلکش فضا میں کشمیر کو جنت سمجھتے ہوئے جس انداز میں اپنے جذبات

کا اظہار کیا ہے۔ وہ چند اشعار میں ملاحظہ فرمائیے ؎

تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را ۔۔۔ نہاد است در دامن کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را ۔۔۔ رہا سازد از محنت انتظارے
چہ خواہم دریں گلستاں گر بہ خواہم ۔۔۔ شرابے، کتابے، ربابے، نگارے

لیکن شاعر جنت کی اس سحر آفریں فضا سے زیادہ دیر مسحور نہیں رہتا۔ کشمیریوں کی زبوں حالی اسے پھر یاد آجاتی ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎

کشمیری، کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ ۔۔۔ بتے می تراشد ز سنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے ۔۔۔ خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او ۔۔۔ نصیب تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے ۔۔۔ نہ در سینۂ او دلِ بیقرارے

ازاں مے فشاں قطرہ بر کشیری ؎
کہ خاکسترش آفریند شرارے

کشمیر کے عنوان سے جو نظم ہے اس میں مناظر قدرت کی کشش بدرجۂ کمال ہے فرماتے ہیں۔

رخت بہ کاشمر کشا، کوہ و تل و دمن نگر ۔۔۔ سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج، مرغ بہار فوج فوج ۔۔۔ صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر
تا نہ فتد بہ زینتش چشم سپہر فتنہ باز ۔۔۔ بستہ بچہرۂ زمیں برقع نسترن نگر
لالہ ز خاک بر دمید، موج بآبجو تپید ۔۔۔ خاک شرر شرر ببیں، آب شکن شکن نگر
زخمہ بہ تار ساز زن، بادہ بہ ساتگیں بریز ۔۔۔ قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر!

دختر کے برہمنے لالہ رخے سمن برے
چشم بروئے او کشا باز بخویشتن نگر!

کلامِ اقبال میں تلمیحات

شاعر کبھی تو لب و لہجہ کی بدولت خیال افروزی کا کھیل کھیلتا ہے اور کبھی بعض دوسرے عناصر کو بروئے کار لاکر اپنی تخیلی عمارت کی تشکیل کرتا ہے۔ تلمیح انہی عناصر میں سے ایک ہے۔ اس طرح کی مدد سے وہ اپنے مخاطب کے ساتھ ذہنی رابطہ پیدا کرتا ہے شاعر کسی مشہور واقعہ یا قصہ کی طرف معمولی اشارہ کرتے ہوئے شعر پڑھنے یا سننے والے کے لئے ایسا پس منظر پیش کر دیتا ہے جس کے سہارے قاری یا سامع اس واقعہ یا قصہ تک پہنچ جاتا ہے۔ مثلاً اقبال جب یہ کہتے ہیں،

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید — ایں دو قوت از حیات آمد پدید

تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ موسیٰ و فرعون اور شبیر و یزید کی تلمیحات استعمال کرنے سے آیا وہ خیال کما حقہ، ہم تک پہنچ جاتا ہے۔ جو اقبال پہنچانا چاہتے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ موسیٰ اور شبیر قوتِ حق کے علمبردار ہیں۔ فرعون و یزید سے وابستہ واقعات سے پہلے آشنا ہیں۔ اس لئے ہم شعر پڑھتے ہی فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ شاعر نے زندگی میں جو حق و باطل کی جنگ جاری و ساری ہے اسے بڑی خوبی کے ساتھ موسیٰ و شبیر اور فرعون و یزید کے سہارے واضح کر دیا ہے۔ اگر کوئی شاعر اپنے کلام میں تاریخی تلمیحات کو کثرت پیش کرتا ہے تو اس سے شاعر کے علم تاریخ پر قادر ہونے کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کلام اقبال میں تلمیحات کا سلسلہ اس امر کی دلیل ہے کہ ان کی نظر حمایہ معقولات

و منقولات پر تھی، تاریخ، فلسفہ، سیاسیات و معاشیات اور قرآن حکیم سے متعلق تلمیحات سے ان کا کلام بھر نظر آتا ہے۔

تلمیح کی نوعیت و ماہیت اور اہمیت واضح کر دینے کے بعد اب ہم اس سرزمین کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ جہاں سے اقبال کی پسندیدہ تلمیحات کے سوتے پھوٹتے ہیں اور بالآخر معانی و مطالب کے ایک متلاطم دریا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ کلامِ اقبال کے سرسری مطالعے سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ علمی و ادبی، تاریخی، تمدنی، مذہبی اور سائنٹفک علوم سے اپنی پسند کی تلمیحات کا انتخاب کرتے ہیں۔ اور ان تلمیحات کا ذخیرہ پہلوؤں کو خاص طور پر اجاگر کرتے ہیں جن سے ان کے نظریات کی ترجمانی یا تائید ہوتی ہے۔ تلمیحات کا ذخیرہ لیں تو روایات کی صورت میں ہر شاعر کے سامنے اس کی علمی استعداد کے مطابق موجود ہوتا ہے۔ لیکن شاعر کی عظمت اور اس کی فنکاری کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ ان کو نئے رنگ اور نئے پہلو کے ساتھ اپنے کلام کا جزو بنا لے۔

تلمیحات کو نئے اور دوسروں سے مختلف رنگ میں پیش کرنے کی یہ کوشش اقبال کے ہاں غیر شعوری نہیں، بلکہ شعوری ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا یہ شعر مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔

بہ ہر زمانہ بہ اسلوبِ تازہ می گویند ۔۔۔ حکایتِ غمِ فرہاد و عشرتِ پرویز

اس حکایتِ غمِ فرہاد اور عشرتِ پرویز کو وہ کس کس رنگ میں اور کس کس لباس میں پیش کرتے ہیں۔ ان اشعار میں دیکھئے:۔

حسن کا گنج گراں مایہ تجھے مل جاتا ۔۔۔ تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں ۔۔۔ یہ شیریں بھی ہے گویا بیستوں بھی کوہکن بھی ہے

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما ۔۔۔ لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم ۔۔۔ کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

فرہاد کی خارا شکنی زندہ ہے ابھی تک — باقی نہیں دنیا میں ملوکیتِ پرویز

تمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو تو کیا — طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ان پیش کردہ اشعار میں شاعر کے جہاں تنوع پسند اور ایک تلمیح کے جملہ پہلوؤں سے آگاہ ہونے کا سراغ ملتا ہے۔ وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے۔ وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شاعر میں تلمیحات کو علامات کی صورت دے دینے کی قدرت موجود ہے۔

مذکورہ اشعار میں ظاہر ہے کہ فرہاد پرویز ہوسناکی وعشق اور مزدور سرمایہ دار کے لیے علامتیں بن کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔ یہ سلسلہ صرف اسی ایک تلمیح تک محدود نہیں۔ بلکہ بعض دوسری تلمیحات کو بھی علامات کا درجہ بخشا گیا ہے۔ قیس ولیلےٰ کے بارے میں کچھ شنیدنی اشعار ملاحظہ ہوں :

رہتی ہے قیس روز کو لیلیٰ شام کی ہوس — اختر صبح مضطرب، تاب دوام کے لیے

ترا اے قیس، کیونکر ہو گیا سوزِ دروں ٹھنڈا — کہ لیلےٰ میں تو ہیں اب تک وہی انداز لیلائی

درد لیلےٰ بھی وہی، قیس کا پہلو بھی وہی — نجد کے دشت وجبل میں رم آہو بھی وہی

اب اسی تلمیح کو اقبال کے مخصوص اسلامی رنگ میں دیکھئے :

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول — لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں — کہ لیلےٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے — نظارے کی ہوس ہو تو لیلےٰ بھی چھوڑ دے

وادیٔ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا — قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا

اس تلمیح کے سلسلے میں اس غزل کے چند اشعار بھی قابلِ ذکر ہیں۔ جس کا عنوان ہے۔ "بہ یکے از صوفیا نوشتہ شد" کہتے ہیں۔

ہوسِ منزلِ لیلےٰ نہ تو داری و نہ من — جگرِ گرمیٔ صحرا نہ تو داری و نہ من

دل دو دیں درگرہ زہرہ وشانِ عجمی — آتشِ شوقِ سلیمی نہ تو داری و نہ من

بیش خون زلیخا نہ تو داری و من   دگر از یوسف گم گشتہ سخن نتواں گفت

عیسٰی کی بیلے نفسی، موسٰی کا عصا، ابراہیم کی آتش پسندی، علی کی حیدری فکر و قوت منصور کا نعرہ انا الحق، مجنوں کی دشت نوردی، فرہاد کی کوہ کنی، ایاز کی نیاز مندی، حسین کی جاں نثاری، یہ جملہ مضامین اقبال کو جو پسند آئے ہیں۔ اور اس نے ان کو موضوعِ سخن بنایا ہے تو اس کے پسِ پردہ وہ قوت کارفرما ہے۔۔۔ جس کے زیر اثر ان مضامین و مطالب کے ڈانڈے اقبال کے نظریات سے ملتے رہیں۔ اقبال کی قوت پسندی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ عصائے موسٰی کے سلسلہ میں یہ کہہ دیں۔ کہ

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم   عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

قوم کی زبوں حالی نے اس حقیقت کی نقاب کشائی پر اسے مجبور کیا کہ

بُت شکن اٹھ گئے، باقی جو ہیں بت گر ہیں
تھا ابراہیم پدر اور پسر آذر ہیں
حیدری فکر ہے نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

اور پھر عظمتِ رفتہ کے حصول کی تمنا نے ان الفاظ میں درسِ عمل دیا:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اقبال کے گلدستۂ کلام میں تلمیحات کے گلہائے رنگ رنگ تعداد میں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے مطالعہ کے لئے ایک مکمل اور ضخیم تصنیف کی ضرورت ہے بہرصورت ان میں سے چند کے محلِ استعمال پر غور کیجئے اور شاعر کی فنی مہارت کی داد دیجئے۔

منصور کو ہوا لبِ گویا پیام موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

ہزار خیبر و صد گونہ اژدر است اینجا!
نہ ہر کہ نانِ جویں خورد حیدری داند

نکلا یہ اجل میں جو عاشق کو مل گیا
پایا نہ خضر نے اسے عمرِ دراز میں

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

ریگِ عراق منتظر، کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسین باز دہ، کوفہ و شام خویش را

کسے ایں معنیِ نازک نداند جز ایاز اینجا
کہ مہرِ غزنوی افزوں کند دردِ ایازی را

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

——— ☆ ———

علامہ اقبال کے کلام میں تشبیہات اور استعارے

علامہ اقبال کے کلام پسند اور ندرتِ آفریں طبیعت نے ان کو اپنے کلام میں صرف معنوی محاسن کی تخلیق پر ہی مجبور نہ کیا، بلکہ شعر کی روح کے ساتھ ساتھ اس کے پیکر یا ہیئت میں دلکشی اور حسن آفرینی پر بھی اکسایا۔ مشہور انگریزی شاعر ٹینی سن کا قول ہے کہ قابلِ توجہ یہ بات نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم کس طرح کہہ رہے ہیں۔ ٹینی سن کی اسی رائے کے جزو ثانی یعنی "کس طرح کہنے کو" ہم ادبی زبان میں اسلوبِ بیان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ہر عظیم شاعر، جہاں مطلب یا مضمون میں تازگی، جدت اور تنوع پیدا کرنے کے لئے بحرِ تخیل میں غوطہ زن ہو کر اچھوتے اور نادر مضامین ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتا ہے، وہاں وہ اظہارِ بیان میں دلکشی، زور اور تاثر کی صفات سمو دینے کے لئے نئی نئی تشبیہات اور نئے نئے استعارے کا سہارا بھی لیتا ہے، اس طرح روح اور جسم کے باہمی ارتباط سے شاعر ایک ایسے پیکر کا خالق بنتا ہے جس کی عظمت کا انحصار تو اس کی روح یعنی مطالب و مضامین پر ہوتا ہے۔ لیکن حسن کا دار و مدار اس کے جسم یعنی الفاظ پر ہوتا ہے۔ ان الفاظ میں ہی وہ تشبیہات اور استعارے شامل ہوتے ہیں۔ جن کو شاعر اپنے فن پارے کا حسن بڑھانے کے لئے یا دوسرے الفاظ میں اپنے اسلوبِ بیان کو مؤثر اور پرکشش بنانے کے لئے کام میں لاتا ہے۔

علامہ کے فارسی اور اردو کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلوب بیان کے مذکورہ بالا تصور سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں اپنی فن کاری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے کلام میں معنوی عظمت بھی پیدا کر لی ہے اور لفظی حسن سے بھی اسے آراستہ کر دیا ہے۔

تشبیہات اور استعارے آرائش کلام کے علاوہ اس وقت وجود میں آتے ہیں۔ جب ہم کسی خیال یا موضوع کو قطعی، واضح، روشن اور ٹھوس صورت میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اس صورت میں تشبیہ یا استعارے کا سہارا لیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر شاعر اپنی ذہنی واردات اور کیفیات کو ٹھوس اشیاء کے ذریعے روشناس کرانے کے لئے یا پھر آزادی اظہار حاصل نہ ہونے کی صورت میں رمز و کنایہ میں بات کہنے کی خاطر تشبیہ اور استعارہ کو وسیلہ بناتا ہے اس شاعرانہ عمل کو ادبی زبان میں تجسیم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ دریں صورت تشبیہ اور استعارے کا کامیابی کے ساتھ استعمال اس بات پر منحصر ہے کہ وہ محولہ بالا ابلاغی مقصد کے پورا کرنے میں کہنے والے کا کہاں تک ساتھ دیتے ہیں۔

علامہ نے اپنے کلام میں جن تشبیہات اور استعاروں کو استعمال کیا ہے ان کا سرسری جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تشبیہ و استعارہ کی غرض وغایت سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان کی تشبیہات اور استعارے مذکورہ بالا صنعتِ تجسیم کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ زندگی کے لئے ان کا سب سے بڑا استعارہ دریا، جو یا سیل ہے، جو زندگی کو مجسم اور محسوس صورت میں پیش کرنے کے لئے شاعر کے مقصد کو پورا کرتا ہے۔

علامہ اقبال کے استعمال کردہ الفاظ اکثر و بیشتر ان کے خیالات اور احساسات کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں۔ جن الفاظ میں بمرور ایام یہ صفت باقی نہیں رہتی کہ وہ

کسی خیال کی کما حقہ ترجمانی کر سکیں۔ علامہ اقبال ان کو نئی معنوی زندگی بخشتے ہیں اور ان کا سینہ چیر کر ان میں نئے معنی سمو دیتے ہیں۔ اردو شاعری کی بیشتر تشبیہات اور استعارے جو اس نے فارسی شاعری سے وراثت میں پائے اقبال کے کلام میں ان کا استعمال اسی رجحان کا پتہ دیتا ہے۔

جس طرح سے پہلے کہا گیا ہے۔ اسلوب بیان کا تعلق بہت بڑی حد تک الفاظ کے انتخاب سے ہے اور الفاظ کے انتخاب کا گہرا رشتہ لکھنے والے کی شخصیت سے ہے۔ لکھنے والے کے قلم کی گہرائیوں میں جو اسرار و رموز مضمر ہوتے ہیں۔ ان کا اظہار ان الفاظ کے ذریعے ہوتا ہے جنہیں لکھنے والا استعمال کرتا ہے یہی الفاظ مصنف کی زندگی کے ترجمان ہوتے ہیں اس کے فنی ارتقاء کا سراغ دیتے ہیں یا مشہور فارسی صاحب طرز انشاء پرداز ابوالفضل کے الفاظ میں یہی نقوش نقاش تک پہنچنے کا معتبر ذریعہ بنتے ہیں ... تحریر پکار پکار کر کہتی ہے کہ میرے خالق کی تعلیمی استعداد اس درجہ کی ہے اس کی فطرت کو بنانے اور سنوارنے میں ان اثرات کو دخل ہے۔ ان اساتذہ سخن کے آگے اس نے اپنا زانوئے ادب تہہ کیا ہے۔ ان کتابوں کی فضا میں اس نے اپنی زندگی بسر کی ہے۔ اسلوب بیان اور استعاروں کے اس گہرے رشتے کے پیش نظر علامہ اقبال ہمیں اپنی استعمال کردہ تشبیہات اور استعاروں میں صاف اپنی شخصیت کی جھلکیاں دکھاتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تشبیہات اور استعارے پکار پکار کر کہتے ہیں کہ ہمیں جنم دینے والا علامہ اقبال ہے۔

علامہ اقبال کو جن تصورات، مبلغات اور رجحانات کی اشاعت و تبلیغ مقصود تھی، انھوں نے ان کی روح کو اپنی تشبیہات اور استعاروں میں بھی سمو دیا ہے۔ علامہ نے ان میں تشبیہات اور استعاروں کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے، جو ان کے پیغام سے ہم آہنگ ہیں۔ ان کی محبوب تشبیہات اور استعاروں میں ہمیں جو

نمایاں صفات نظر آتی ہیں۔ ان کو مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے ۔ ۔ ۔ علامہ نے وہ تشبیہات استعمال کی ہیں جن میں مسلسل تگ و دو، کشمکش، سوز جستجو اور شوق و آرزو کے اثرات نمایاں ہیں۔ دریا، جوئبار، آگ، شعلہ، پروانہ اور جگنو اسی لیے علامہ اقبال کو پسند ہیں۔

چونکہ یہ امر مسلم ہے کہ علامہ اقبال حرکت و عمل اور حیات و بقا کے علمبردار ہیں، اس لیے ان کی تشبیہات اور استعارے انہی صفات کے ترجمان ہیں۔ دریا انہیں اسی لیے پسند ہے اور بحر ناپیدا کنار سے بھی اسی لیے محبت ہے۔ حرکت کی آئینہ دار بہت سی تشبیہات ہمیں ان کی نظم "بزم انجم" میں ملتی ہیں۔ اس نظم کے مطالعہ سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ سب چیزیں حرکت و عمل کی عکاس ہیں۔ سورج کے غروب ہوتے وقت طشتِ افق سے لالے کے پھول لے کر شام کی سیہ قبا پہ گل نشانی کرنا، اور شفق کا سونے کا زیور پہنا دینا اور قدرت کا اپنے چاندی کے گہنے اتار دینا، اور عروسِ شب کے پیارے موتیوں کا چمکنا۔ یہیں انجمن فلک میں لے جاتا ہے، جس میں زندگی پہلی زندگی ہے اور حرکت و حرارت ہی رقصاں و جولاں ہیں۔ ان تشبیہات کی ندرت و طرفگی یہ ذوق ادبی وجد کے عالم میں پہنچ جاتا ہے اسی طرح ان کی ایک اور نظم کرمکِ شب تاب، نہایت پیاری پیاری اور دل نشیں تشبیہات اور استعاروں کا مرقع ہے لکھتے ہیں "

یا اختر کے ماہِ مبین مکینے "

نزدیک تر آمد بہ تماشائے زمینے از چرخ بریں نے

یہ نظم فی الحقیقت ایک مسلسل استعارہ ہے، کبھی وہ کرمکِ شب تاب کو ایک ذرہ بے ماہ کہتے ہیں اور کبھی متاع نفس اندوختہ یا دامانده شعاع کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں ۔

اقبال کی جملہ تشبیہات اور استعارے اپنے اندر ایک گہرائی اور معنوی پہنائی لیے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں اکثر علامات کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ تشبیہات ان کے ہاں کم اور علامات کا استعمال زیادہ ہے۔ ان کی پسندیدہ اور مشہور علامت جو ان کے تصورِ خودی کے حامل مردِ مومن کے لیے وضع کی گئی ہے۔ لالہ کا پھول ہے، لالہ کا پھول بعض صورتوں میں صرف فردِ واحد تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ ساری ملتِ اسلامیہ کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اسرارِ خودی میں لکھتے ہیں۔

من مثالِ لالۂ صحرا ستم　　　　در میانِ محفلِ تنہا ستم

اور پھر ایک دوسری جگہ لالہ کو خونیں کفن کہہ کر امتِ محمدیہ کی حالت زار و زبول کو دلگداز صورت میں پیش کرنا، لالہ کے علامت ہونے کی روشن دلیل ہے۔

اقبال کی تشبیہات بالعموم قریب المأخذ ہوتی ہیں اور ان میں قوتِ حس بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ وہ جدت و تازگی سے بھرپور شعر کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔ ان کی جگنو والی نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں　　　　یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارا　　　　یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا　　　　غربت میں آ کے چمکا، گمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا　　　　ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

اقبال کی بعض تشبیہات میں عربی زبان کی تشبیہات کا انداز نمایاں ہے۔ مسجد قرطبہ کی بیشتر تشبیہات ایسی ہی ہیں۔ "تار حریر دو رنگ" اور "ہجومِ نخیل" اس کی واضح مثالیں ہیں۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض تشبیہات کی خوشہ چینی انہوں نے مغربی شعراء کے کلام سے بھی کی ہے، ایک جگہ کہتے ہیں ؎

پھرتی ہے وادیوں میں کیا دخترِ خوش خرامِ ابر

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں ؎

صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار

ان کے علاوہ دوسری تشبیہات کا استنباط انہوں نے دیگر اردو شعراء کی طرح فارسی شاعری ہی سے کیا ہے لیکن جیسا کہ قبل ازیں کہا گیا ہے۔ انہوں نے ان کی بھی اپنی افتادِ طبع کے مطابق نوک پلک درست کی ہے۔ اقبال کا پروانہ جگنو یا شعلہ دوسرے شعراء کے روایتی پروانے جگنو یا شعلہ سے بالکل مختلف ہے۔ بلبل و قمری کی بجائے باز اور شاہین کا انتخاب ان کے افکار کا آئینہ دار ہے۔ یہ دونوں پرندے انہیں اس لئے پسند ہیں کہ وہ مظہرِ قوت ہیں۔ مردِ مومن کی صفات کے مالک ہیں، باہمت ہیں غیور ہیں، بلند پرواز ہیں، کہیں اپنا آشیانہ نہیں بناتے ۔۔۔ شاہین کے عنوان سے جو نظم انہوں نے لکھی ہے، اس میں پیش کردہ تشبیہات کا رنگ یہی ہے اس کے علاوہ ناقہ کو دخترِ صحرا اور ملکۂ ابر رواں کہنا، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اقبال تشبیہات استعمال کرنے کا صحیح شعور رکھتے تھے۔ اقبال نے اپنی دل پسند تشبیہات ماہِ نو، جو، خورشید، شعلہ، انجم اور لالہ کو جس عمدگی کے ساتھ اپنے کلام کی زینت بنایا ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ چند متعلقہ اشعار کو پیش کر دیا جائے۔

ہندیم از پارسی بیگانہ ام	ماہِ نو باشم تہی پیمانہ ام
تنے پیدا کن از مشت غبارے	تنے محکم تر از سنگین حصارے
درونِ او دل درد آشنائے	چو جوئے در کنار کوہسارے
انجم بگریبان زنخت، ایں دیدۂ تر مارا	بیروں زسپہر انداخت، ایں ذوقِ نظر مارا
صورت نہ پرستم من، بتخانہ شکستم من	آں سیل سبک سیرم، ہر بند گسستم من
بود و نبود ماست زیک شعلۂ حیات	از لذتِ خودی چو شرر پارہ ایم

غنچہ دل گرفتہ را از نفسم گرہ کشائے　　تازہ کن از نسیم من داغ درون لالہ را

عزمے زدم کہ شاید نوا قرارم آید　　تپ شعلہ کم نگردد ز گسستن شرارہ

شاعر عام طور پر اپنے کلام کو موثر اور جاذب نظر بنانے کے لئے رمزیت وایمائیت سے بھی کام لیتے ہیں۔ یہ صورت بعض اوقات اس طرح پیدا ہو جاتی ہے کہ آزادی پر پہرے لگے ہوتے ہیں۔ اس بیچارگی اور بے بسی کے عالم میں شاعر جھنجھلا اٹھتا ہے ـــــ تب ہی تو غالب کہتے ہیں ؎

مقصد ہے ناز و غمزہ وے گفتگو میں کام　　چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کے بغیر

اس کیفیت کے پیدا کرنے کے لئے تشبیہ واستعارہ کو کام میں لایا جاتا ہے۔ ان مضامین و افکار کو حسن کا اظہار رائج الفاظ میں ممکن نہیں ہوتا یا دستور زبان بندی اظہارِ حقیقت میں مانع ہوتا ہے۔ تشبیہ و استعارہ کے دامن میں پناہ لینا پڑتی ہے۔ صیاد گلچیں کے ذکر اور نشیمنوں پر لہراتی ہوئی بجلیوں کے بیان سے حکمرانوں کے جور و ستم اور وطن کے تمام سیاسی حالات کی جانب مبہم... اشارے ڈھکے چھپے انداز میں ملتے ہیں ـــــ اقبال کی بعض... تشبیہات اور استعارے بھی اسی شاعرانہ اندازِ بیان کے آئینہ دار ہیں .... شاعر اظہارِ حقیقت سے گریز کرتے ہوئے بھی ان کے سہارے بہت کچھ کہہ گزرتا ہے اسی پردہ داری اور رمزیت میں دیدہ بینا شاعر کے حقیقی ماحول کو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ ہندوستان کی سیاست۔ اسلامی ممالک کی زبوں حالی مسلمانوں کی بے حسی، مزدور طبقہ کے مصائب و آلام انگریزوں کی ایذا رسانی، سرمایہ داروں کی محنت آفرین چالوں کو اقبال نے بھی رمزی ایمائی

قوتوں کے سہارے یا بصورت دیگر تشبیہات و استعارات کے روپ میں پیش کرتے ہوئے ماحول کی دکھتی ہوئی رگوں کو چھیڑا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت و بزرگی کا راز بہت بڑی حد تک اسی میں مضمر ہے۔

اقبال کا ایک محبوب موضوع ۔ تعلیم و تربیت

من آں علم و ہنر را با پرِ کاہے نمی ارزم کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

علامہ اقبال نے اپنے فارسی اور اردو کلام، مختلف مضامین و تقاریر اور خطوط میں جن گوناگوں موضوعات کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم و تربیت ان کا محبوب موضوع ہے اس کے متعلق مجمل اور مفصل دونوں صورتوں میں انہوں نے اپنی آرا پیش کی ہیں۔ مختلف مجموعوں میں چند منتشر اشعار اور نظموں کے علاوہ "ضربِ کلیم" میں ایک باب تعلیم و تربیت کے بارہ میں موجود ہے۔ چند خطوط اور مضامین بھی اس سلسلہ میں قابلِ توجہ ہیں۔ ان تحریروں کی مدد سے تعلیم و تربیت کے متعلق علامہ کے نظریات پیش کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس ماحول کا اجمالی جائزہ لیا جائے۔ جس میں اقبال نے پرورش پائی۔ جس نے ان کے دل و دماغ کو متاثر کیا اور انہیں تعلیم و تربیت کے متعلق ایک خاص اندازِ فکر رکھنے والا مفکر بنایا۔

ہندوستانی مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جب ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی بدلے ہوئے حالات میں واحد صورت یہ ہے کہ حکمران طبقہ کی طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ اور اپنی معاشی سماجی اور تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے

لہٰذا ان مقاصد کے حصول کی خاطر اور ان کے ساتھ ایک منظم گروہ کی صورت میں سرگرم عمل ہوئے۔ اور تاریخ ہند و پاکستان میں ان کوشش سرسید کی اصلاحی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک کے زیر اثر مسلمانوں نے اپنی تعلیمی حالت بہتر بنانے کے لئے اسکول اور کالج کھولے، معاشی حالت سدھارنے کے لئے تجارت کی طرف توجہ دی اور سماجی وقار حاصل کرنے کے لئے حکومتِ وقت کا ساتھ دیتے ہوئے سرکاری عہدے قبول کئے۔ حکمران چونکہ مغربی تھے اور مسلمانوں نے سرسید کے زیر اثر اپنی زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش حکمراں سے سمجھوتہ کی خاطر کی تھی۔ اس لئے مغربی تہذیب و تمدن اثر کا مسلمانوں پر ناگزیر تھا۔ نتیجۃً مسلمانوں نے صرف مغربی علوم اور مغربی طرزِ تعلیم کو ہی اپنے مدارس میں رائج نہ کیا۔ بلکہ مغربی رسم و رواج کو بھی اپنایا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اسی اندازِ فکر و عمل کے عکاس ہیں۔ سرسید اور ان کے رفقاء کے زیر اثر حکومت وقت سے تعاون کرنے والے گروہ کے علاوہ بعض لوگ ایسے بھی تھے کہ جو اپنی شکست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور حکمران کا ہر آن اور ہر لمحہ مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں ملک و ملت کی بہتری حکومتِ وقت سے تعاون کے ساتھ وابستہ نہ تھی۔ بلکہ اپنی صدہا سالہ تہذیب کے تحفظ پر منحصر تھی۔ یہ لوگ جن میں لکھنؤ کے مشہور مزاحیہ اخبار "اودھ پنچ" کے نامہ نگار پیش پیش تھے۔ اپنا اندازِ فکر جداگانہ رکھنے کے باعث سرسید اور ان کی تحریک کے مخالف تھے۔ اردو زبان کے مشہور شاعر اکبر الٰہ آبادی کا تعلق اسی گروہ سے تھا۔ انہوں نے سرسید کی تحریک اور مغربی تہذیب کو ظریفانہ انداز میں اپنے طنزیہ تیروں کا نشانہ بنایا۔ اسی مزاحیہ اور طنزیہ اندازِ بیان کو علامہ اقبال "بانگِ درا" میں شامل ظریفانہ کلام میں اپنائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اکبر مغربی تہذیب کے مخالف تھے۔ اور مغربی تعلیم کو مشرقی ماحول کے لئے ناموزوں سمجھتے تھے ان کے خیال میں مشرقی علوم و فنون اور ماضی کی شاندار روایات سے رشتہ توڑنا

اور مغربی تعلیم و تربیت سے رشتہ جوڑنا مسلمانوں کے لیے سود مند نہ تھا۔ اس سلسلہ میں ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

نیشنل عزت کے گم ہونے کا ہے اکبر کو غم — آنریبل عزت کا کچھ اس کو مزا ملتا نہیں

اصل سے ہو کے جدا نسو و نما کی امید — مجھ کو حیرت ہے کہ بوڑھوں میں یہ بچپن کیسا

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے — مگر یونہی کہ گویا آب زمزم مے میں داخل ہے

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر — گرائیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم — رنگ مذہب میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

زاہدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی — اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

اکبر کے جو اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں بیان کیے گئے خیالات سے اقبال کو اتفاق ہے اور وہ تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں اکبر کے ہمنوا ہیں۔ لیکن اس ہمنوائی میں وہ اکبر سے سبقت لے جاتے ہیں۔ اور اپنے خیالات کو اشعار کے قالب میں اسطرح ڈھال لیتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والا ایک لمحہ کے لیے ان پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتا اکبر کے ظریفانہ رنگ میں اقبال نے جو نئی تعلیم پہ پھبتیاں کسی ہیں، ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفریں — پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض — دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق — کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں — مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے

وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف — پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

سرسری نظر میں اقبال نئی روشنی کی مخالفت اور روایت کی پشت پناہی

کے اعتبار سے اکبر سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن ان کے کلام کا عمیق مطالعہ کرنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ پگڈنڈی جو شروع میں شاہراہ اکبر سے پھوٹی تھی اقبال کے ہاں خود ایک شاہراہ کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اور کامیابی کی منزل تک پہنچانے کی ضامن بن گئی ہے۔ کیونکہ اکبر نے تو صرف مزاحیہ صورت میں ہی اپنے خیالات پیش کئے ہیں لیکن اقبال نے مزاحیہ اشعار کہنے کے علاوہ سنجیدہ اور رنگین صورت میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ ایک منظم تعمیری پروگرام پیش کرتے ہیں جو ماضی حال اور مستقبل کے باہمی رشتہ پر منحصر ہے۔ وہ جدت و ندرت کے دلدادہ ہیں۔ اپنے تیشہ سے اپنا نیا راستہ بنانے کی دعوت دیتے ہوئے دوسروں کی راہ پر چلنے کو عذاب قرار دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود تعلیم و تربیت کے میدان میں روایت کے محافظ اور اپنے ماضی سے رشتہ قائم کرنے کے حق میں ہیں۔ وہ مستقبل کے درخشاں چہرے پہ ماضی اور حال کے چہرے سے نظر ڈالنے کی دعوت دیتے ہیں۔ مستقبل کی منزل تک پہنچنے کے لئے سلامتی کی راہ ان کے خیال میں اپنے ہی ماضی اور حال کی راہ ہے۔ اغیار کی راہنمائی میں بہانہ پیمائی ان کے خیال میں پُر خطر ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو ‏ ‏ ‏ از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو

سرزند از ماضی تو حالِ تو ‏ ‏ ‏ خیزد از حال تو استقبال تو

مشکن از خواہی حیاتِ لازوال ‏ ‏ ‏ رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

موج ادراکِ تسلسل زندگی ست ‏ ‏ ‏ مے کشاں را شورِ قلقل زندگی ست

تہذیبِ نو اختیار کرنے والوں کو کہتے ہیں ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا!

اکبر اور اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ بے جو اکبر کے

ہاں سدھ سروں میں الاپی جارہی ہے۔ اقبال کے ہاں مغنی اسے تیور سروں میں آلاپ رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ سے میں شدت اور زور اقبال کی قوت پسندی کا نتیجہ ہے۔

اقبال کے ذہن میں چونکہ سفرِ یورپ اور فلسفۂ عجم کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو گئی تھی۔ کہ قوم کے انحطاط کا باعث وہ بے عملی ہے۔ جو ان متصوفانہ عناصر کی بدولت ہے جو زندگی سے گریز سکھاتے ہیں۔ لہٰذا کھوئے ہوئے وقار اور چھینی ہوئی عظمت کے دوبارہ حصول کے لئے انہوں نے قوم کو عمل کا درس دیا۔ اقبال سے پہلے حالی نے بھی عمل کی اہمیت کا بدیں صورت احساس دلایا تھا ؂

کمال کفش دوزی علم افلاطون سے بہتر ہے   یہ وہ نقطہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی

لیکن عمل کے بیان میں جو گہرائی اور۔ توانائی اقبال کے ہاں ہے، حالی اس سے محروم ہے

اقبال نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی شخصیت کی تشکیل کے لئے انہوں نے جن افراد کو اپنا مخاطب بنایا ہے، وہ ایسے لوگ ہیں۔ جن کی رگوں میں شباب کا خون گردش کرتا ہے اور جو قوت و حرارت کا مجسمہ ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس منزل پر اقبال "جوانوں کو پیروں کا استاد کر دے۔" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب جوانوں پر ہی اقبال کے جہانِ نو کی تشکیل کا انحصار ٹھہرا تو وہ ان جوانوں کی تعلیم و تربیت سے کیسے غافل رہ سکتے ہیں۔ بدیں سبب انہوں نے اس اہم موضوع کی طرف   ایک خاص توجہ دی ہے۔ اور ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز میں تعلیم و تربیت کے عنوانات کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کے نظریات ایک عام انسان یا شاعر کے نظریات نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ماہر تعلیم کے نظریات ہیں۔ اور اسی لئے ہمارے لئے بہت زیادہ قابلِ توجہ اور گرانقدر ہیں۔ اقبال کو مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ معلم کے فرائض ادا کرنے کے مواقع بھی میسر آئے تھے۔ انہوں نے اسکول کے طلباء کے لئے اردو کی درسی کتابیں بھی تیار کی تھیں اور پھر کچھ عرصہ

لیجسلیٹو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے بھی نئے نظامِ تعلیم سے پیدا شدہ مسائل کا جائزہ لینا پڑا تھا۔ ان حقائق سے واضح ہے کہ اقبال تعلیمی مسائل میں عملی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اور ان کے خیالات ایک ماہر تعلیم و تربیت اور ایک تجربہ کار استاد کے خیالات ہیں۔

محولہ بالا خیالات بالخصوص ان مکاتیب اور تحریروں میں موجود ہیں جن کے معرضِ وجود میں آنے کی وجہ ہی علمی ہے۔ اقبالیات کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کے مختلف تعلیمی اداروں یا محکمہ ہائے تعلیم کے متعلق حکیم الامت سے مشورے طلب کئے گئے اور انہوں نے کہیں مجمل صورت میں اور کہیں مفصل صورت میں اپنی آرا پیش کیں ۱۹۳۳ء میں افغانستان کا سفر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ افغانستان کے معاملات میں وہ گہری دلچسپی رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ شاہِ افغانستان نے جب تعلیمی امور کے متعلق مشورہ کے لئے ان سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے ذاتی طور پر سید سلیمان ندوی کو بھی اس سفر کے لئے آمادہ کیا۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۳ء کو سید سلیمان ندوی کو اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"شاہِ افغانستان آپ سے تعلیم مذہبی کے بارہ میں مشورہ چاہتے ہیں، شاید اسی ماہ ستمبر میں آپ کو کابل سے دعوت آئے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ جانے کے لئے تیار ہوں گے۔ ممکن ہے کہ سید راس مسعود اور اقبال بھی، آپ کے ہمراہ ہوں۔"

افغانستان کے علاوہ ترکی بھی ایک ایسا ملک ہے جس کے نظامِ تعلیم کے متعلق وہ غور و فکر سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ قسطنطنیہ یونیورسٹی کے پروفیسر خالد خلیل کے نام ایک انگریزی خط میں فرماتے ہیں:۔

"میرے نزدیک قسطنطنیہ یونیورسٹی کے ادارہ دینیات نے یہ نہایت

دانشمندانہ کام کیا ہے اگر اسلامی علم الانساب کا کام باقاعدہ طور پر کیا گیا تو اغلباً ایسے انکشافات بروئے کار آئیں گے، جن سے دنیائے اسلام کی بابت ترکوں کا دائرہ نظر وسیع تر ہو جائے گا اور اس طرح پر ممکن ہے کہ تو خیز نسل کا ذہنی اور روحانی نصب العین محکم تر ہو جائے۔ علاوہ ازیں اس قسم کی تحقیقات سے انسانی علوم کے سرمایہ میں اضافہ ہوگا اور ممکن ہے نسلی خصوصیتوں کی تہ میں وحدت روح کے ایسے سامان دریافت ہو سکیں، جن کا اندازہ سطحی مشاہدہ سے مشکل لگایا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے اس سے یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو سکے کہ ایشیا کی سیرت کی تشکیل میں، جس کا راز اب تک معلوم نہیں کیا جا سکا ہے مہتم بالشان تاتاری نسل کی بعض اہم تر شاخیں کارفرما رہی ہوں۔

شاعر مشرق نے مندرجہ بالا سطور میں جس پہلو کو پیش کیا ہے۔ اس کی اہمیت سے آج بھی انکار ناممکن ہے، آج بھی یہ سطور ابھری دنیا کی صورت میں نمایاں ہونے والے ایشیائیوں کو دعوت فکر دیتی ہیں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے نام بھی تعلیم و تربیت کے بارے میں حکیم الامت کا ایک بصیرت افروز طویل خط ملتا ہے جسے ٹامس آرنلڈ کی مجوزہ کتاب پر تبصرہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس خط میں انہوں نے دیوبند اور لکھنؤ کے بہترین مواد کو بروئے کار لانے کی مختلف سبیلوں کا ذکر کرتے ہوئے جو حقائق پیش کئے ہیں، ان میں سے مندرجہ ذیل پاکستان کے ماہرین تعلیم کے لئے آج بھی قابل توجہ ہیں کیونکہ ان کا ہمارے تعلیمی مسائل سے گہرا تعلق ہے۔

۱۔ "یورپ میں اسلام کا سیاسی زوال بدقسمتی سے کہا جاتا ہے، ایسے وقت میں رونما ہوا جب مسلم حکماء کو اس حقیقت کا احساس ہونے لگا تھا کہ انتخراجی علم لامذہبی ہیں اور جب وہ استقرائی علوم کی تعمیر کی طرف کسی حد تک مائل ہو چکے تھے دنیائے اسلام میں تحریکِ ذہنی عملاً اس وقت سے مسدود ہو گئی اور یورپ نے مسلم حکماء کے غور و فکر کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونا شروع کیا۔ یورپ میں جذبہ انسانیت کی تحریک بڑی حد تک ان قوتوں کا نتیجہ تھی، جو اسلامی تفکر سے بروئے کار آئیں۔"

۲۔ "دیوبند اور لکھنؤ کے وہ لوگ جو خالص سائینٹفک تحقیقات کا مخصوص ذوق نہ رکھتے ہوں، ان کو ان کے میلاناتِ طبعی کے مطابق جدید ریاضیات سائنس اور فلسفہ کی مکمل تعلیم دینی چاہیے۔ جدید سائنس اور حکمت کی تعلیم پورا کرنے کے بعد ان کو اجازت دے دی جائے کہ وہ آرنلڈ کا کورس پورا کریں، جس کو ان کی ضرورتوں کا لحاظ کر کے مختصر کر دیا جائے گا۔ مثلاً صرف اس شخص کو آرنلڈ کورس کا نمبر ۳ "دنیائے اسلام اور سائنس" پر لیکچر سننے کی اجازت دی جائے جو صرف طبعی سائنس پڑھ چکا ہے۔"

۳۔ "آرنلڈ کا کورس، ان لوگوں کو لینے کی اجازت ہونی چاہیے جو سائنس یا فلسفہ میں خاص دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ مسلم تمدن اور تہذیب کے اصولوں کی عام تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اسے صرف لکھنؤ اور دیوبند کے لوگوں تک محدود نہیں کرنا چاہیے، آپ کی اپنی یونیورسٹی کے ایسے لوگ جو عربی اچھی طرح جانتے ہیں، اسے اختیار کر سکتے ہیں، مگر اس کورس میں مسلم آرٹ اور فنِ تعمیر بھی شامل کرنا چاہتا ہوں۔"

۴۔ "یہ جتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ان لوگوں کے لئے جو اسلامی حکمت، ادبیات، آرٹ، تاریخ نیز دینیات کا نصاب اختیار کریں گے جرمن اور فرانچ زبانوں کا حسب ضرورت جاننا از بس ضروری ہے۔"

۵۔ "چونکہ ان کو انگریزی کی تعلیم محض کام چلانے کے مطابق حاصل کرنی ہو گی میں یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانات سے ایم اے اور بی اے سے انگریزی کو بالکل حذف کر دینا چاہتا ہوں۔ ان امتحانات میں ان کو صرف سائنس اور فلسفہ کے مضامین لینے کی ضرورت ہو گی۔"

"خطبات" کا مطالعہ بھی اس سلسلہ میں دلچسپی سے خالی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ترجمانِ حقیقت نے گوناگوں صورتوں میں اس اہم موضوع کو پیش کیا ہے۔ ان کی جملہ تحریروں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مغربی نظام تعلیم پسند نہیں کیونکہ وہ ان کے تصورِ حیات سے ہم آہنگ نہیں، حرکت و قوت سے عاری ہے اور روح کو مردہ بنا دیتا ہے۔ مستعار خیالات پر مبنی ہے اور بے مقصد ہے۔ شاہین بچے کو پرواز نہیں سکھاتا بلکہ کرگسی صفات کا مالک بناتا ہے۔ طلباء میں جستجو، شوق و تمنا اور مسلسل جد و جہد کی صفات پیدا کرنے کی بجائے انہیں کوتاہ نظر بے عمل اور تن آسان بناتا ہے۔ روحانی اور اخلاقی اقدار سے بیگانگی پیدا کرتا ہے۔ آزادی کے خیالات پیدا کرنے کی بجائے غلامی سے مانوس ہونے کا درس دیتا ہے ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اقبال کا خیال ہے کہ ہندوستان میں مغربی طرزِ تعلیم کو رواج دینے کا عمل انگریزوں کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ حکومتِ وقت کا یہ خیال ہے کہ

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

اقبال کے خیال میں ایک فرد اس صورت میں خودی کی صفت سے متصف

ہوسکتا ہے۔ اور اپنے اندر مرد مومن کی صفات پیدا کر سکتا ہے۔ جب اس کی تعلیم و تربیت ایک خاص مقصد کے پیش نظر مناسب و موزوں ماحول میں پایۂ تکمیل تک پہنچی ہو۔ اور وہ کتاب خوان نہ ہو بلکہ صاحب کتاب ہو۔ اقبال مقصد کی طرف اس قدر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ کہ عصر حاضر میں جو درس و تدریس (PROJECT SYSTEM) کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے مقصدی پہلو کی اہمیت اور قدر و منزلت واضح ہو جاتی ہے۔ کلام اقبال کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں تعلیم کا مقصد تخلیقی ہے اور وہ مضمون قابل درس و تدریس ہے جو تخلیقی مقصد کو پورا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ سائنس کی تعلیم اس صورت میں پسندیدہ اور ضروری ہے۔ جب وہ تسخیر کائنات اور انسان کی بہتری کا وسیلہ بنتی ہے۔ لیکن جب سائنس جذبات و روح کو کچلنے کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اقبال یہ کہتے ہیں۔

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

علامہ اقبال اس علم کے مداح اور داعی ہیں جو دین سے بیگانگی نہیں سکھاتا۔ بلکہ خود دین کی حدود میں محفوظ و مامون رہتا ہے۔ خواجہ غلام السیدین کو اس سلسلہ میں لکھتے ہیں :۔

"علم سے میری مراد وہ علم ہے۔ جس کا دار و مدار حواس پر ہے عام طور پر میں نے علم کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے۔ جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہئے۔ اگر علم دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے . . . مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو مسلمان

کہے۔ "بولہب را حیدرِ کرار کنُ" اگر یہ بولہب حیدرِ کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اگر اس کی قوتِ دین کے تابع ہو جائے تو نوعِ انسان کے لئے سراسر رحمت ہے۔"

اقبال کی نظر میں وہ تعلیم و تربیت قابلِ تعریف ہے، جس کا حاصل کرنے والا باعمل ہو اور شاہین کی صفات کا حامل ہو۔ ایک مقصد کو پالینے کے بعد جو دوسرے مقصد کا جویاد متلاشی ہو اور مشکلات و تکالیف کا سامنا کرنے سے جو گھبرائے نہیں بلکہ مشکل پسندی کا مظاہرہ کرے۔ زندگی سے گریز کی راہ اختیار نہ کرے بلکہ کش مکش حیات میں بڑھ کر حصہ لے۔ ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دے انسانیت کش نہ ہو بلکہ انسان پرور ہو۔ اور یہ مذکورہ صفات اس صورت میں تعلیم و تربیت کی بدولت پیدا ہو سکتی ہیں۔ جب تعلیم کا مقصد ڈگری یا ملازمت حاصل کرنا نہ ہو، بلکہ تعلیم علمی ذوق اور اس قرآنی تصور کی تکمیل کے لئے حاصل کی جائے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ جس نے خود کو پہچان لیا۔ اس نے خدا کو پہچان لیا۔ اور خود کو پہچان لینا چونکہ اپنی شخصیت سے آگاہ ہونا ہے۔ اس لئے اقبال کا تصور خودی ہی در اصل ان کے تصورِ تعلیم و تربیت کی تشریح و توضیح ہے۔ اور پھر علم کے لغوی معنی ہی چونکہ جاننا کے ہیں۔ اس لئے اس اعتبار سے بھی اقبال کے تصور خودی کا تعلق علم کے ساتھ بہت گہرا ہے۔ علم و خودی کے اس تعلق کی وجہ سے ہی دونوں کے بعض فروعی موضوعات، جہاں اقبال نے بیان کئے ہیں، وہاں دونوں میں ہم آہنگی نمایاں ہے جس طرح خودی کے مستحکم ہونے کے لئے ایک مقصد کی تکمیل کے بعد دوسرے مقصد کی منزل سے گزرنا لازمی ہے۔ یہاں تک کہ مقاصد کا سلسلہ لامتناہی ہو جائے اسی طرح علم میں اضافہ کے لئے بھی ضروری ہے کہ آدمی کبھی کبھی اپنے آپ کو

علم کے اعتبار سے مکمل نہ سمجھے اور ہمیشہ گمان کا شکار رہے اس سلسلہ میں کہتے ہیں :-

ہمائے علم تا افتد بدامت — یقین کم کن گرفتار شکے باش
زیر کی بفروش و حیرانی بخر — زیر کی ظن است و حیرانی نظر

ایک دوسرے مقام پر علم اور خودی کے رشتہ کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

علم از سامانِ حفظِ زندگی است — علم از اسباب تقویم خودی است
علم و فن از پیش خیزانِ حیات — علم و فن از خانہ سازانِ حیات

گذشتہ سطور سے واضح ہے کہ اقبال علم کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور وہ اس علم سے متنفر ہیں۔ جو آدمی کو بیکار بنا دیتا ہے۔ اس کے برعکس وہ علم جو عمل کا درس دیتا ہے اور خودی کی حفاظت کرتا ہے۔ قابلِ ستائش ہے۔

اقبال اس سلسلہ میں مغربی علوم کی تدریس کے بھی حامی ہیں۔ لیکن اس حد تک جو عمل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس بارہ میں کہتے ہیں :-

شرق را از خود بُرد تقلیدِ غرب — باید ایں اقوام را تنقیدِ غرب
قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب — نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
محکمی او نہ از لا دینی است — نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است — از ہمیں آتش چراغش روشن است
علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ — مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ

اقبال جہاں شخصی آزادی کے زبردست حامی ہیں۔ وہاں وہ آدابِ محفل کے سختی سے پابند ہیں۔ ارمغانِ حجاز میں بے ادب کے متعلق لکھتے ہیں۔

ندارم آں مسلمان زادہ را دوست   کہ در دانش فزود و در ادب کاست

اقبال کی نظر میں استاد کا مقام بہت بلند ہے۔ اپنے اساتذہ کرام سید میر حسن اور پروفیسر آرنلڈ کی بارگاہ میں انہوں نے اشعار کی صورت میں جو عقیدت کے پھول پیش کئے ہیں ان میں استاد کا احترام نمایاں ہے۔

آخر میں علامہ اقبال کی اس نظم کا حوالہ دینا بہت مناسب معلوم ہوتا ہے جو "بانگِ درا" میں ایک بچے کی دعا کے عنوان سے شامل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبال نے اس نظم میں تمنا کی صورت میں، بہت ہی سادہ اور آسان الفاظ میں میں ایک مثالی طالب علم کے طریقِ عمل کو پیش کر دیا ہے۔ در حقیقت یہ نظم ایک بچے کی دعا نہیں بلکہ ایک طالب علم کی دعا ہے۔ بچہ ان الفاظ خدا کے حضور میں دعا مانگتا ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری   زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے   ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے۔

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت   جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یا رب   علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب!

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا   درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو!
نیک جو راہ ہو اس راہ پہ چلانا مجھ کو

اقبال دوستی کا ایک تقاضا

خود احتسابی

گو شاعرِ مشرق علامہ اقبال برصغیر کے وہ خوش نصیب شاعر ہیں کہ جن کے متعلق دنیا کی مختلف زبانوں میں متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں اور سینکڑوں مضامین شائع ہو چکے ہیں لیکن اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ اب تک اقبال شناسی کا حق ادا نہیں ہوا۔ اقبالیات کا جائزہ لینے کے بعد یہ محسوس نہیں ہوتا کہ شاعر مشرق کی زندگی، ان کے افکار اور ان کے فن کے متعلق سب کچھ لکھا یا کہا جا چکا ہے۔ اقبالیات کے طالب علم کی حیثیت سے میرا یہ تاثر ہے کہ ابھی تو ہم نے اقبال شناسی کے سفر کا آغاز

کیا ہے، وہ منزل ابھی بہت دور ہے، جسے اقبال دوستی کہا جاتا ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں دنیا کے مسلمانوں نے بالعموم اور برصغیر کے مسلمانوں نے، بالخصوص سب سے زیادہ باتیں جس شاعر کے متعلق سنی یا پڑھی ہیں، وہ بلاشبہ شاعرِ مشرق ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی بلا خوفِ تردید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ان کا اثر کما حقہ، صورت میں قبول نہیں کیا گیا۔

کیا گفتار کے غازی مسلمان کردار کے بھی غازی بن چکے ہیں؟ کیا ہم ان کے افکار کے مطابق انفرادی اور ملی سطح پر اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں؟... انسانیت کے ارفع اور اعلیٰ معیار کے پیشِ نظر کیا آج بھی انسان دیو و دد سے ملول نہیں اور انسان کا آرزومند نہیں! آج کے سمگلروں ذخیرہ اندوزوں، رشوت خوروں، زندگی کے ہر شعبہ میں ملاوٹ سے کام لینے والوں کا طرزِ عمل کیا جانوروں اور درندوں سے مختلف ہے! کیا محمود و ایاز نخوتی دل سے ایک صف میں کھڑے ہو چکے ہیں! کیا مرید کا گھر بھی پیر کے گھر کی طرح روشن ہو چکا ہے! کیا کاخِ امراء کے در و دیوار واقعی ہل چکے ہیں! کیا جوان اب تن آسانی کا شکار نہیں، کیا اب سادہ دل غریب مسلمان کو ذکر و فکر صبح گاہی میں مست نہیں رکھا جاتا! کیا دیو استبداد اب جمہوری قبا میں پاکوبی نہیں کرتا! کیا اب حقیقت خرافات کی نذر نہیں ہوتی! کیا اب مکر کی چالوں سے سرمایہ دار کی جیت نہیں ہوتی! کیا اب مزدور انتہائی سادگی سے مات نہیں کھاتا! کیا اب برصغیر کے شاعر، صورت گر و افسانہ نویس کے اعصاب پر عورت سوار نہیں! کیا آج کا استاد روایات کے پھندوں میں گرفتار نہیں! کیا آج کا مسلمان قرآن میں غوطہ زن ہو کر جدتِ کردار کا مالک بن چکا ہے!

یہ سوالات اور اسی قسم کے کئی دوسرے سوالات اقبال دوستی کا دعویٰ کرنے

دالوں اور یومِ اقبال منانے والوں سے خود احتسابی کا تقاضا کرتے ہیں۔ اگر ان سوالات کے جوابات مثبت انداز میں پیش کئے جا سکتے ہیں اور جوابات میں علم کے ساتھ عمل کی شہادت ملتی ہے تو پھر شاعرِ مشرق سے عقیدت کا دعویٰ درست ہے۔ خود احتسابی کے امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔ لیکن اگر جوابات منفی صورت میں ہیں تو پھر ندامت سے سرنگوں ہونا لازمی ہے۔ تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ مقدر بن چکا ہے۔ ؎

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ناکامی کے اس قعرِ گمنامی سے باہر نکلنے یا گر کر سنبھلنے کے لئے عزمِ نو اور ولولۂ تازہ کی ضرورت ہے لیکن یہ سہارے اسی صورت میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر احساس زیاں ہو۔ اور احساسِ زیاں اسی وقت ہوتا ہے، جب خود احتسابی کا اصول اپنایا جائے۔ میرے خیال میں اقبال دوستی کی پہلی اور آخری شرط یہ ہے کہ ہم اپنے اقوال اور اعمال کا خود محاسبہ کریں۔ شاعرِ مشرق کا اپنا اندازِ فکر اور طرزِ عمل بھی اسی رجحان کا ترجمان ہے۔ اپنے اشعار اور اپنی تحریروں میں وہ اپنا محاسبہ کرتے ہیں۔ اپنی شخصیت اور اپنی زندگی کے ہر اچھے یا برے پہلو کے متعلق وہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ بانگِ درا کے پہلے حصے میں شامل نظم زاہد و رندی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ زاہد کی زبان سے اپنے اقوال اور اعمال کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

پابندیٔ احکامِ شریعت میں ہے کیسا — گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی
سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا — ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی
ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا — تفضیلِ علی ہم نے سنی اس کی زبانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل — مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے — عادت یہ ہمارے شعراء کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت — اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی

یورپ میں قیام کے زمانہ کی مشہور نظم "عاشق ہرجائی" اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے، جس میں اپنے آپ کو بدیں صورت مجموعہ اضداد قرار دیتے ہیں۔

ہے عجب مجموعہ اضداد اے اقبال تو
رونقِ ہنگامہ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے

بانگِ درا کے حصہ سوم میں "نصیحت" کے عنوان سے جو نظم ہے، اس میں اقبال اپنا محاسبہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

میں نے اقبال سے از راہِ نصیحت یہ کہا
عاملِ روزہ ہے تو، اور نہ پابندِ نماز

تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس، لب پہ ترے ذکرِ حجاز

جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے
تیرا اندازِ تملق بھی سراپا اعجاز

ختم تقریر تری مدحتِ سرکار پہ ہے
فکرِ روشن ہے ترا موجدِ آئینِ نیاز

درِ حکام بھی ہے تجھ کو مقامِ محمود
پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلفِ ایاز

اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز

نظر آ جاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن
اثرِ وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز

دست پرور ترے ملک کے اخبار بھی ہیں
چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز

اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے
تیری مینائے سخن میں ہے شرابِ شیراز

جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے، وہ ہیں تجھ میں سبھی
تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریکِ تگ و تاز

غمِ صیاد نہیں، اور پر و بال بھی ہیں
پھر سبب کیا ہے، نہیں تجھ کو دماغِ پرواز

میں سمجھتا ہوں کہ خود احتسابی کی روش اختیار کرنے کا یہ خوشگوار نتیجہ نکلا کہ اقبال نے جوانی کی نادانیوں سے بہت جلد چھٹکارا حاصل کر لیا اور "رموزِ بیخودی" میں حضور رحمۃ للعالمین اپنا حال بدیں الفاظ بیان کیا:۔

مدتے با لالہ رویاں ساختم | عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم | بر چراغِ عافیت داماں زدم
برقہا رقصید گرد حاصلم | رہزناں بُردند کالائے دلم!
ایں شراب از شیشۂ جانم نہ ریخت | ایں زرِ سارا ز دامانم نہ ریخت
عقلِ آذر پیشہ ام زنار بست | نقشِ او در کشورِ جانم نشست
سالہا بودم گرفتارِ شکے | از دماغِ خشکِ من لا ینفکے!

زندگی را از عمل ساماں نبود | پس مرا ایں آرزو شایاں نبود
شرم از اظہارِ او آید مرا | شفقتِ تو جرأت افزاید مرا

حقیقت یہ ہے کہ اقبال خود احتسابی کی بدولت اپنی دنیائے عمل میں خوب سے خوب تر کے متلاشی رہے اور سامنے سے ترجمانِ حقیقت، حکیم الامت اور شاعرِ مشرق جیسے القابات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان کے فن کی عظمت، اور ان کے افکار کی بلندی کا راز اسی رجحان میں مضمر ہے۔ اپنے کلام کی حک و اصلاح، نظرِ ثانی، ردو بدل اور انتخاب کے مراحل سے کامیابی کے ساتھ وہی گزر سکتا ہے جو اپنا محاسبہ کرنے والا ہو۔ فکری اعتبار سے صداقت اور حقیقت تک اسی کو رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ جو اپنی معلومات کو جانچنے اور پرکھنے والا ہو۔ اقبال ایک ایسے فنکار اور ایک ایسے مفکر تھے۔ شعروں کے علاوہ ان کے مکتوبات میں بھی ان کے اس رجحان کا سراغ ملتا ہے، مثلاً ۷ رجولائی ۱۹۱۱ء کو عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں :-

"جہاں تک نظموں کا تعلق ہے، میں بخوشی ایک نسخہ آپ

کو ارسال کروں گا۔ میرے ایک دوست نے مجھے میری نظموں کا اپنا ایک مرتب کردہ مجموعہ بھیجا ہے میں نے کتابت کے لئے ایک آدمی رکھ لیا ہے۔ جب وہ اپنا کلام ختم کرے گا تو میں کل پر نظر ثانی کروں گا۔ اشاعت کے قابل نظموں کو دوبارہ لکھوں گا اور ان کی ایک نقل آپ کو بھجوا دوں گا۔۔۔۔۔ میری مشکل اشاعت کے لئے انتخاب ہے۔ پچھلے پانچ چھ سالوں میں میری نظمیں بیشتر نجی نوعیت کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور میرے خیال میں عام لوگوں کو انہیں پڑھنے کا کوئی حق نہیں۔ ان میں سے بعض تو کالعدم میں نے تلف کر دی ہیں۔ اس ڈر سے کہ کہیں کوئی جبراً شائع نہ کر دے۔ بہر حال میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے۔''

والد نے مجھے بو علی قلندر کی طرز پر فارسی میں ایک مثنوی لکھنے کے لئے کہا ہے۔ دشواری کے باوجود میں نے اس کام کا بیڑا اٹھا لیا ہے۔''

حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی ایک کوشش خاں محمد نیاز الدین خاں کے ۲ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کے ایک مکتوب میں اس طرح ملتی ہے:۔

"علی گڑھ سے ابھی تک کوئی خبر نہیں آئی۔ اسلامیہ کالج میں بھی وہی حالات پیدا ہو چلے تھے۔ مگر طلباء کو چھٹی دے دی گئی ہے۔ اور الحاق کے بارے میں خود ان کی رائے میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ اب اس بارے میں ارکین انجمن کو تر دد نہ

رہے گا۔ میری تو یہی رائے ہے کہ گمرانت اور الحاق کے بارے میں جو فتویٰ علما کا ہو۔ اس پر عمل کرنا چاہیے۔ چونکہ واجب الطاعت امام اس وقت موجود نہیں۔ اس واسطے جمہور مشاہیر علمائے ہند کا فتویٰ ضروری ہوگا۔ صرف ایک عالم کا فتویٰ اس بارے میں کافی نہیں، خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ علما کی غالب جماعت کا اس پر اتفاق ہونا چاہیے۔ ذاتی رائے میری خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اگر علما کا فتویٰ میری ذاتی رائے کے خلاف ہو تو سر تسلیم خم ہے۔ جہاں تک میں اندازہ کرتا ہوں قرآن کے احکام اس بارے میں صاف و واضح ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض مشہور علما فتویٰ دیتے ہوئے خائف ہیں۔ بعض کی خدمت میں میں نے خطوط لکھے ہیں، مگر امید نہیں کہ جواب ملے۔"

خود احتسابی ایک ایسا عمل ہے کہ جس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے ہم خودشناسی اور خودی سے آشنا ہوتے ہیں۔ اپنے من میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پاتے ہیں۔ اگر ہم اپنا محاسبہ نہیں کر سکتے، جن سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، ان کے نقشِ قدم پر نہیں چل سکتے تو پھر ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہماری عقیدت کا اظہار خلوص پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مطالبات کے اس دور میں خود احتسابی کی طرف توجہ دینے کی آج جتنی ضرورت ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ کسی اخبار کے کسی صفحے پر نظر پڑے تو یہ ناممکن ہے کہ کوئی مطالبہ سامنے نہ آئے۔ کسی انجمن کا جلسہ ہو اور بات مطالبے تک نہ پہنچے، یہ نہیں ہو سکتا۔ ہر جگہ، ہر صورت میں مطالبہ ہی مطالبہ ہے۔ آنکھوں کے سامنے مطالبہ، کانوں میں مطالبہ، شعور میں مطالبہ، لاشعور میں مطالبہ اس کے

ساتھ ہی یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہر ایک اپنا مطالبہ منوانے کے لئے بے قرار ہے لیکن دوسرے کے مطالبہ سے بیزار ہے۔ پھر ایک مطالبہ کی پیداوار کئی دوسرے مطالبات۔ اس دنیا کا ایک ہی علاج ہے اور وہ خود احتسابی ہے جب تک ہر فرد اپنی ذات کا محاسبہ کرنے کے بعد فرض شناسی سے کام نہیں لے گا۔ اصلاحِ احوال کی صورت ممکن نہیں۔ فرد ہی کے لئے یہ طرزِ عمل ضروری نہیں ملت کے لئے بھی ضروری ہے کیونکہ شاعرِ مشرق یہ فرما چکے ہیں۔

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم!
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

ختم شد

Zaman Ahmad Khan

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس کی ادبی معیاری کتب

کتاب		مصنف	پیسے	روپے
شرح دیوانِ غالب	=	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	..	۳۰
بانگ درا مع شرح		″ ″ ″ ″ ″ ″	..	۲۰
شرح بالِ جبریل		″ ″ ″ ″ ″ ″	..	۱۴
شرح ضربِ کلیم		″ ″ ″ ″ ″ ″	..	۱۲
ارمغانِ حجاز مع شرح		″ ″ ″ ″ ″ ″	..	۹
رموزِ بے خودی مع شرح		″ ″ ″ ″	..	۱۵
جاوید نامہ مع شرح	=	حصہ اوّل ″	..	۴۰
″ ″ ″		حصہ دوئم ″	..	۶۰
مثنوی پس چہ باید کرد مع شرح		″ ″	..	۶۰
دیوان حالی مع شرح	=	اصغر حسین لدھیانوی	..	۲۰
اطراف اقبال	=	ملک حسن اختر ایم۔اے	..	۲۰
اقبال اور عشقِ رسول	=	پروفیسر عبد الرشید	..	۱۵
اقبال اور عبد الحق	=	پروفیسر ممتاز حسن خاں	..	۱۰
مطالعات و مکاتیب	=	سید اختر الاسلام	..	۲۰
یادِ اقبال	=	ڈاکٹر عبد الحمید صاحب	..	۶
تعلیماتِ اقبال	=	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۵۰	۱۵
بصیرتِ اقبال	=	مولوی محمد طاہر فاروقی ایم۔اے	..	۱۸

انتخاب کلامِ ظفر فن و شخصیت ـ پروفیسر خواجہ تہور حسین .. ـــ ١٨

انتخاب کلامِ ظفر ـ بہادر شاہ ظفر ٥٠ ـــ ٥

مقدمات عبد الحق ـ ڈاکٹر عبادت بریلوی .. ـــ ٧٥

مومن اور مطالعہ مومن ″ ″ ″ ″ ٥٠ ـــ ٣٦

اُردو ادب میں فن سوانح نگاری ـ الطاف فاطمہ ٥٠ ـــ ١٢

تنقیدی نقوش ـ ڈاکٹر عبد القیوم ″ ″ .. ـــ ٥

اربابِ نثر اُردو ـ سید محمد صاحب ٥٠ ـــ ١٢

فنِ افسانہ نگاری ـ سید وقار عظیم ″ ″ ″ .. ـــ ١٠

تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات ـ عبد الوہاب ظہوری .. ـــ ٩

الفاروق ـ شبلی نعمانی .. ـــ ١٢

حقوق القرآن ـ مولانا تھانوی ٥٠ ـــ ٥

دستِ صبا ـ فیض احمد فیض ٥٠ ـــ ٣

بت تراش ـ یاقوتہ رحمان .. ـــ ٢٠

سوکھے پتّے ـ حمیدہ جبین .. ـــ ١٢

زخمِ دل کہا نہ جائے ـ وحیدہ نسیم .. ـــ ٢٠

بابک خرمی ـ عبد الحلیم شرر ٥٠ ـــ ٨

ندرت ابنِ حیات ″ ″ ″ ″ .. ـــ ٥

زادِ راہ ـ منشی پریم چند .. ـــ ٥

میرے بہترین افسانے ـ منشی پریم چند ٥٠ ـــ ٦

نرملا ـ منشی پریم چند ٥٠ ـــ ٦

اُردو میں ڈرامہ نگاری ـ سید بادشاہ حسین .. ـــ ٩

کتاب	قیمت
غبارِ خاطر ۔ مولانا آزاد	.. —— ١٢
کلیاتِ جگر ۔ جگر مرادآبادی	.. —— ١٠
تاریخ زبانِ اُردو ۔ شمس اللہ قادری	٥٠ —— ٧
کلیاتِ حسرت ۔ حسرت موہانی	.. —— ١٥
مقالاتِ سرسید ۔ محمد عبداللہ خاں خویشگی	٥٠ —— ٧
لسانی مسائل ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری	.. —— ١٠
کلیاتِ اقبال اُردو ۔ علامہ اقبال	.. —— ١٢
تمدّنِ ہند ۔ مترجمہ سیّد علی بلگرامی	.. —— ٢٠
مباحث ۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ	.. —— ٢٠
نقدِ میر ۔ ״ ״	.. —— ١٠
الکلام ۔ شبلی نعمانی	.. —— ٧
الغزالی ۔ ״ ״	.. —— ٧
کلیاتِ فیض ۔ فیض احمد فیض	.. —— ٩
کلیاتِ شکیل ۔ شکیل بدایونی	.. —— ٩
تہذیب الاخلاق ۔ سرسید احمد خان	.. —— ١٠
اُردو قواعد ۔ مولوی عبدالحق	.. —— ١٠
درندہ ۔ اظہار اثر	٥٠ —— ٣
جذباتِ فطرت ۔ پروفیسر محمد الیاس برنی	٥٠ —— ١٢
مناظرِ قدرت ۔ ״ ״ ״	٥٠ —— ١٢

دیگر اداروں کی کتب